سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سوانح و افکار

تضاد: شاہ جی کے مطالعہ کتب کا شوق۔ لکھا ہے: "شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی تھی"۔ صفحہ 15 پھر لکھا ہے" کوئی نئی کتاب مل جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں ساتھ ہی رکھتے"۔ صفحہ 25

انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام۔ صفحہ 21

انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ صفحہ 27

"پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی ہیں"۔ صفحہ 27

"اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کے منہ چوم لوں گا" صفحہ 29

"چھ چھ گھنٹے میں قرآن پاک ختم کیا" صفحہ 56 سبحان اللہ صریحا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی خلاف ورزی۔ دیکھیں بخاری حدیث نمبر 5052

شاہ دل" پھینک" واقع ہوئے تھے۔ شاہ جی "لغو پر ریجھ چکے تھے" صفحہ 58 قرآن تو کہتا ہے ھم عن اللغو معرضون

شاہ جی کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے شوقین تھے۔ صفحہ 61

شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی کے لطیفے پر شاہ جی نے "مادر و خواہر کی مغلظات سنا دیں" صفحہ 85

"احرار جو کچھ کہتے رہے وہ تحریک پاکستان کے خلاف تھا" صفحہ 99

شورس کاشمیری

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سوانح و افکار

مطبوعاتِ چٹان

۸۸ میکلوڈ روڈ ○ لاہور

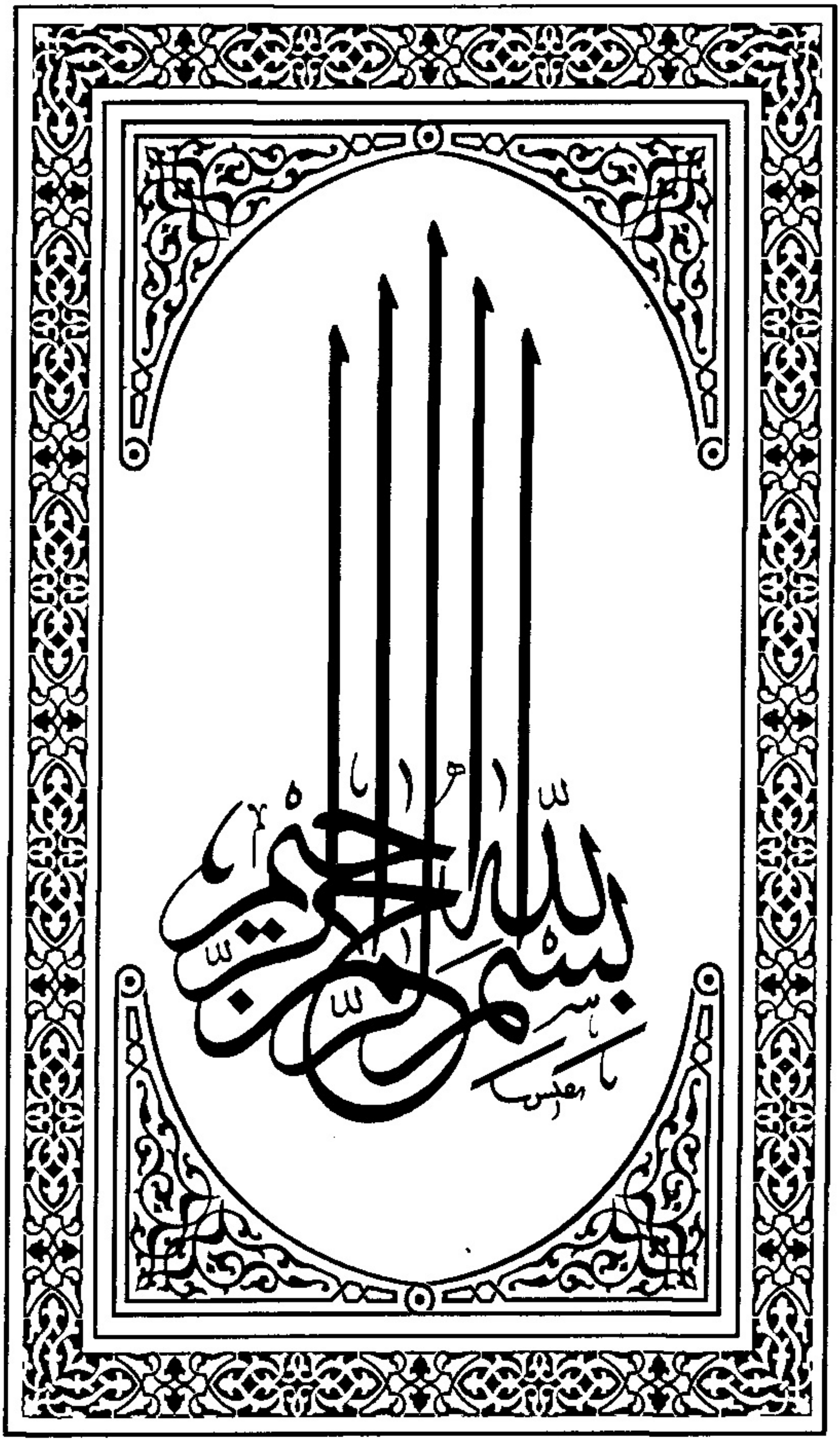
بسم الله الرحمن الرحيم

تضاد: شاہ جی کے مطالعہ کتب کا شوق۔ لکھا ہے: "شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی تھی"۔ صفحہ 15 پھر لکھا ہے" کوئی نئی کتاب مل جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں ساتھ ہی رکھتے"۔ صفحہ 25

انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام۔ صفحہ 21

انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ صفحہ 27

"پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی ہیں"۔ صفحہ 27

"اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کے منہ چوم لوں گا" صفحہ 29

"چھ چھ گھنٹے میں قرآن پاک ختم کیا" صفحہ 56 سبحان اللہ صریحا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی خلاف ورزی۔ دیکھیں بخاری حدیث نمبر 5052

شاہ دل" پھینک" واقع ہوئے تھے۔ شاہ جی "لغو پر ریجھ چکے تھے" صفحہ 58 قرآن تو کہتا ہے ھم عن اللغو معرضون

شاہ جی کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے شوقین تھے۔ صفحہ 61

شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی کے لطیفے پر شاہ جی نے "مادر و خواہر کی مغلظات سنا دیں" صفحہ 85

قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ما کان محمد

ابا احد من رجالکم

ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین

محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر

Muhammad is not the father of any one of your men, but the Messenger of ALLAH (God) and the Seal upon all the Prophets.

قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

میں "خاتم النبیین" ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

فہرس

۱	شروع کی بات	صفحہ ۹
۲	ایک کہانی - ایک تاریخ	۱۳
۳	خاندانی حالات	۳۵
۴	قید و بند	۷۷
۵	جماعت احرار	۹۳
۶	میرزائیت (پاکستان سے پہلے)	۱۲۳
۷	میرزائیت (پاکستان کے بعد)	۱۶۱
۸	لاثانی خطیب	۱۹۵
۹	تحریکِ ختم نبوت	۲۱۵
۱۰	احرار کی تحریکیں	۲۵۳
۱۱	چند یادیں	۲۷۵

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کُنیم
بایں فسانہ مگر عُمرِ خود دراز کُنیم

● ——— میں نے قبر سے زیادہ واعظ، کتاب سے زیادہ مخلص دوست اور تنہائی سے زیادہ بے ضرر ساتھی کوئی نہیں دیکھا ———

——— عبداللہ بن عبدالعزیز

شروع کی بات

اس کتاب کے لکھنے کا خیال فسادات پنجاب کی انکوائری کمیٹی کے مختلف اجلاسوں (از یکم جولائی ۱۹۵۳ء تا فروری ۱۹۵۴ء) کی کارروائی سے پیدا ہوا جب رپورٹ چھپی تو یہ خیال اور بھی پختہ ہو گیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔

اولاً : ان لوگوں کا طرز عمل جو بزعم خود علما کے استخفاف پر قہقہے اُڑا رہے تھے۔

ثانیاً : پولیس افسروں کی یادداشتوں کا وہ حصہ جس میں شاہ جی کی ذات کو زیر بحث لایا گیا تھا۔

میں نے "چٹان" میں علما کی اہانت کے خلاف اسی وقت احتجاج کیا تھا۔ باوجودیکہ میں نے اپنی سیاسی زندگی کے بہت سے لیل و نہار داعیان شریعت کی ہمراہی میں بسر کیے ہیں لیکن نہ تو میرا نقطۂ نگاہ ان سے موافق رہا نہ میں نے حیات مستعار کے پیراہن میں منبر و محراب کا کوئی پیوند قبول کیا اور نہ شرعی برہمنوں کو مافوق البشر سمجھا ——— مجھے شکایت یہ تھی کہ بغیر امتیاز علمار کے خلاف جو باتیں کہی جاتی ہیں ان رعایت سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو ظاہراً بیان کی جاتی ہے۔ کس گروہ میں کالی بھیڑیں نہیں ؟ کیا ارباب سیاست کی جماعت اس سے خالی ہے ؟ لیکن گالی دینے کے لئے ہمیشہ علما ہی کو نشانے پر رکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سیاسی سازش کے تحت بعض مقدس الفاظ بھی ذلیل کئے گئے ہیں۔ مثلاً یار غار، خلیفہ، ملاّ، زیدہ، بکر، عمر۔

اس سازش سے جس بدگوئی کا سراغ ملتا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان کا استعمال روزمرّہ ہوگیا ہے۔

مُلّا کے خلاف طعن و تشنیع کی گرم بازاری بے شبہ سیاسی وجوہ سے ہے۔ بعض شب کور نقادوں نے اپنی نفسی کوتاہیوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے نہ صرف مُلّا کو ہدفِ تنقید بنایا بلکہ اس کی آڑ میں ان صلحائے اُمت کو بھی رگید اجن کا تنہا قصور یہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت اور اس کی بیوروکریسی کے خلاف لڑتے رہے۔ جن علما نے تکفیر المسلمین میں ظالمانہ حصہ لیا ان کے خلاف سیاست دانوں میں کبھی مزاحمت یا مدافعت کی کوئی آواز نہیں اُٹھی مگر جن علما نے قربانی و ایثار کی زندگی بسر کی یا یورپی دانشوروں کی اس کھیپ کو اس کے اعمال و افعال پر ٹوکا ان کے خلاف سب و شتم کے بازار میں ہمیشہ ہی رونق رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے عام انتخابات میں یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔

شاہ جی کے خلاف سرکاری یادداشتوں کی حیثیت محض تعفن کا ڈھیر ہے۔ اس کی سڑاند کا تقاضا تھا کہ اصل حقیقت بے نقاب ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہ اہل قلم جنہوں نے شاہ جی کی رفاقت میں عمر کا بڑا حصہ بسر کیا۔ اس فرض سے عہدہ برا ہوں گے لیکن چاروں طرف طویل سناٹا چھایا رہا۔ جن لوگوں نے میری اس کتاب کے عرصہ بعد شاہ جی کے سوانح پر قلم اٹھایا انھیں نزدیکان بے بصر کہنا انسب ہوگا۔

میں اپنے سوانح اسیری بہ عنوان "پسِ دیوارِ زنداں" لکھنے میں مشغول تھا۔ بعض دوستوں نے مجبور کیا کہ جوابی تصریحات لکھوں لیکن اولاً رپورٹ کا محاسبہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ثانیاً تحریک کے پس منظر میں جو گُل کھلے تھے ان کے پیشِ نظر کچھ عرصہ توقف و انتظار زیادہ مناسب تھا۔ بہرحال میں نے شاہ جی کی سوانح عمری لکھنے کا قصد کیا۔ اب جو حالات فراہم کرنے شروع کئے تو سب سے بڑی روک خود شاہ جی تھے یا بعض ایسے دوست جن سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا لیکن وہ تعاون کے لئے آمادہ نہ تھے اسی اثنا میں بعض ناشدنی باتیں مجھ تک پہنچیں میں

نے ارادہ توڑ ڈالا اور قلم کی ادارتی صحبتوں میں واپس چلا گیا۔

ایکا ایکی یہ تمام تقاضے پھر سامنے آگئے اور دوستوں کی رضا کے آگے جھکنا پڑا۔ میں اس ساری کتاب کو محض "نفسیاتی مطالعہ" تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ مگر جس شخصیت کے یہ سوانح ہیں اس کا گردو پیش اسے قبول نہ کرتا۔ بہرکیف جس طرز پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ فی الجملہ یہ کوئی مکمل سوانح عمری نہیں، کچھ خاکے اور کچھ عکس ہیں۔ مگر مکمل، جامع اور مبسوط۔ بحمد اللہ اب کوئی خلا نہیں رہا، حتی الامکان سب خلا پورے ہو گئے ہیں، شاہ جی کی دختر فرخندہ اختر نے اپنے ایک نامہ گرامی سے خاندانی حالات کی تصحیح فرما دی۔ ان کا خط میری اہلیہ کے نام تھا، اب یہ محض خاکے یا عکس نہیں رہے، سوانح عمری ہے۔ میں چاہتا تھا شاہ جی کم سے کم خاندانی حالات کے حصہ ہی کو حسن کر تصحیح فرما دیتے لیکن انہوں نے گوارا نہ کیا اور میں نے بھی اصرار مناسب نہ سمجھا، وہ فقر و استغنا کے انسان تھے، قرطاس وقلم سے انہیں چڑ تھی۔

کوئی سی کوتاہی رہ گئی ہو تو مجھے اس کی تصحیح و اصلاح میں خوشی ہوگی میں نے جو کچھ لکھا اپنی جذبے سے لکھا اور کوشش کی ہے کہ تحریر کا دامن کسی آلودگی سے داغدار نہ ہو۔ میں نے الفاظ کے چناؤ میں پورے غور و فکر سے کام لیا اور بار بار قطع و برید کی ہے اس پر بھی اگر کوئی لفظ قلم سے ایسا نکل گیا ہو جو نفس مضمون کی ثقاہت کے خلاف ہو تو مجھے اہل ذوق سے عفو خواہی میں تامل نہ ہوگا۔ البتہ سی آئی ڈی کی یادداشتوں کے بارے میں دو چار فقرے عام اسلوب سے ذرا مختلف نظر آئیں تو یہ ان یادداشتوں کا ردعمل ہے جن کی تلخی اور سختی زہرناک تھی۔ نطشے کہتا ہے۔

"میں ان بھیانک چہروں سے خوف کھاتا ہوں جو صبح کے اجالوں پر اپنی کھوکھلی ہنسی پھینکتے ہیں۔"

ناشکر گزاری ہوگی اگر میں محب گرامی مولانا تاج محمود لائل پوری کے ان مخلصانہ

تقاضوں کا اعتراف نہ کروں جن کی شدت کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے محاسن انہی کی مساعیٔ مشکور کا ثمرہ ہیں اور جو قبائح آپ دیکھ رہے ہیں وہ تمام تر میرے قلم کی درماندگیاں ہیں۔ بہرحال وہ تمام دوست میرے سپاس و تشکر کے حقدار ہیں جو قلم کے اس سفر میں اپنے مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔

ہمیں عشق است برخود چیدہ چنیں داستاں ورنہ
کسے از معنیٔ یک حرف صد دفتر نمی سازد

شورش کاشمیری

لاہور
۱۱ ستمبر ۱۹۵۶ء

ایک کہانی —— ایک تاریخ

شاہ جی ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے اور جو اپنی متنوع زندگی کے باعث مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں ان شخصیتوں کا صحیح تاثر ان کے قرب ہی سے مرتب ہوتا ہے۔

شاہ جی کے چہرے مہرے سے عنان خیال معاً ان یونانی فلسفیوں کی طرف مڑ جاتی جن کے فکر و نظر کی بہت سی سائیں صدیوں کی شب کاری کے باوجود روشن چلی آتی ہیں اور جن کے تصویری پیراہن ان شدہ داغوں کی یاد دلاتے ہیں جن کی صورتوں سے ایک ساحرانہ شکوہ کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہ جی کا تیکھا سک قرون وسطیٰ کے ان حکما و فقہا اور علما و خطبا سے مشابہ تھا جو طلوع تاریخ سے پہلے یونان و روما میں اور طلوع تاریخ کے بعد بغداد و دہلی میں پائے جاتے تھے۔

اتفاق کہیے کہ بعض دوامی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں، مثلاً نیٹشا، غورث، کارل مارکس، رابندرناتھ ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظر، عقیدہ و ایمان اور علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہ تھی لیکن کچھ ایسا بانکپن ضرور تھا کہ ان کا چہرہ مہرہ بر صفائی بعد کے باوجود ایک سا تھا۔ بہر حال یہ ایک شاعرانہ چیز ہے ان بڑوں کی زندگی ایک خاص طرز رکھتی ہے جس سانچے میں بھی ڈھلیں ہمیشہ ابھرے ہوئے ملیں گے یہ کسی کے نقش پا نہیں ڈھونڈتے بلکہ لوگ ان کے نقش پا کی تلاش میں رہتے ہیں۔

شاہ جی کی زندگی ۔ س نہج پہ استوار ہوئی اس میں ادب و سیاست کا ایک رومانی امتزاج تھا، ظاہر ہے کہ ایک رومانی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے اس میں سوے سے اوق عبارتیں ہوتی ہی نہیں، ایسا شخص جذبات پر جیتا اور جذبات پر مرتا ہے ۔ اس میں احساس کی شدت اور استغنا کی شرافت تا حد کمال ہوتی ہے ۔ اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں کون کیا سوچتا ہے اس کی ذات ہی اس کا پیمانہ ہے وہ گرد و پیش سے متاثر ہوتا اور چاہتا ہے کہ گرد و پیش اس سے متاثر ہوں اس کی روح اس وقت معراج پہ ہوتی ہے جب وہ عام چہروں میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے ؎

یک چراغ است درین خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

۱۹۴۷ء کا ذکر ہے غالباً مارچ کا مہینہ تھا۔ پنجاب میں عام فسادات پھوٹ چکے تھے شاہ جی اس سے تو خوش تھے کہ انگریزوں کا چل چلاؤ ہے لیکن اس کا انہیں بہت ہی دکھ تھا کہ ملک بھر میں خون خرابہ بے قابو ہو گیا ہے۔

ہمارے اصرار پر وہ امرتسر سے لاہور چلے آئے اور دفتر احرار میں مقیم تھے ۔ دن بھر محفلیں جمتیں ۔ گئی رات تک دربار لگا رہتا ۔ عام عقیدت مند جمع ہوتے اور ان کے انوار سخن سے جھولیاں بھرتے لیکن ان دنوں ان کے چہرے پہ ہنسی کے آثار بہت تھوڑے تھے ۔

اس سے پہلے وزارتی مشن کے زمانے میں ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے ۔ وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار دور تھا ۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر آپ اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں ۔ وہ طرح دے گئے ان کے نزدیک اس کی ضرورت ہی نہ تھی ، وہ تحریر کو ایک فتنہ سمجھتے اور اپنے اس عقیدے کو ہمیشہ دہراتے کہ جب سے حافظہ کی جگہ تحریر نے لی ہے انسان کو نہ صرف عقلی اعتبار سے ضعف پہنچا ہے بلکہ ہر کہیں عجیب الخلقت تنازعوں کی

آب وہوا پھیل گئی ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح اس دور کو ترقی کا دور نہیں کہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک یہ خسران کا دور تھا اور تحریر اس خسران کی بیخ دار بنیادوں میں سے ایک ہے۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے؟ ——— مولانا ابوالکلام آزاد نے "تذکرہ" میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامیٔ حیات دو روزے نہ بود بیش
آں ہم کلیم بالتو چگونہ چساں گزشت
یک روز صرف بستن دل شد بایں و آں
روزے دگر بکندن دل زیں و آں گزشت

تفصیل طلب کی تو مسکرا دیئے، آغا فہمیدیم اور بس ——— لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف تھا۔ مولاناؒ اپنے سے باہر جھانکتے نہیں تھے اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی، مولاناؒ کے لئے تخلیہ صحبت عیش تھا شاہ جی کے لئے جان کنی۔ مولاناؒ کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہ کر پاتے تھے، شاہ جی نے عمر بھر کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی تھی۔

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

یہاں لاہور میں ان کی آزردگی بڑھتی ہی گئی۔ ہر روز ایک نیا سانحہ! پہلے انہیں ہندوستان کی بربادی کا غم تھا اب وہ مسلمانوں کے لئے بے چین تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ وہ کلکتہ، نواکھالی اور بہار کے حالات سے پہلے ہی مغموم تھے۔ اب جن حالات میں خضر وزارت کا استعفیٰ ہوا تھا اور اس استعفیٰ سے پہلے مسلم لیگ نے جو مظاہرے اور مجاہرے کئے تھے شاہ جی کی طبیعت پر ان کا ایک منفی اثر تھا۔ فسادات جنگل کی آگ تھے اور وہ انسانی خون کا تماشا دیکھ ہی نہ سکتے تھے فرماتے:

"بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب کا رُکنا محال ہے":

خضر وزارت کے خلاف بلا ناغہ احتجاجی جلوس نکل رہے تھے۔ ان جلوسوں میں زبانِ طیش کی ساری خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ شاہ جی مغرب کے وقت دفتر کے چھجے میں آ کھڑے ہوتے، ان مظاہروں کا نظارہ کرتے اور جب بے قابو نوجوانوں کی آوازیں شفق میں گھلنے لگتیں تو سرد آہ بھرتے اور کہتے:۔

شورش! ـــــ مجھے نظر آ رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے، مکان جل رہے۔ دکانیں لٹ رہی اور قزاق عصمتیں اٹھائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں، ماں بیٹے کو چھوڑ چکی۔ باپ بیٹی کو ہار چکا ہے، چاروں طرف قیامت کا صور پھک گیا ہے:

پھر ایکا ایکی ملنگوں کے انداز میں نعرہ گونجانے لگتے۔

"کر دے چٹیل میدان مولا کر دے چٹیل میدان ـــــ لعنت بر پدر فرنگ"

اور لفظ فرنگ پر خاص زور دیتے۔ نعرے کی یہ آواز کبھی کبھار شاہ محمد غوث کی مسجد سے اٹھتی ہوئی اذان سے جا ٹکراتی۔ نیاز مند شاہ جی کے اس قلندرانہ نعرے پر مسکراتے اور شاہ جی جھنجھلا کر فرماتے۔

"میاں آج ہنستے ہو کل روؤ گے، تم نہیں دیکھ سکتے، میں دیکھ رہا ہوں جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وبا پھوٹ چکی، ایک وبا آ رہی ہے تب ان کی زبان پر قرآن مجید کی آیتیں جاری ہو جاتیں۔ ان کی قرأت میں گداز پیدا ہو جاتا، ان کے لحن میں آنسو آ جاتے اور ہم سب ان کا منہ تکا کرتے۔ ہمارا وجدان شہادت دیتا کہ فقیر غلط نہیں کہہ رہا لیکن عقل سپر انداز ہونے سے انکار کرتی، ہم کہتے:۔

"شاہ جی! حالات ابھی اتنے خراب نہیں انگریزوں کا مفاد ....." اور وہ فقرہ ہی توڑ لیتے۔

"ہاں بھائی انگریزوں کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کو تلہ ہو جائیں، لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی یہ لو آزادی ——— ؟ یہ اس کی پہلی قسط ہے"۔

شاہ جی! سیاست؟

"ہاں میں جانتا ہوں، سیاست کے معنی ہیں مگر، کلام اللہ میں بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ میں نے لفظ سیاست سے زیادہ کوئی شریر لفظ نہیں دیکھا۔ یہ خدع و فریب کے ایک ایسے اجتماعی کاروبار کا نام ہے جس سے بالو لوگ اغراض کی دکان چمکاتے ہیں"۔

اور میں جی ہی جی میں سوچ کر چپ ہو رہتا ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

بظاہر یہ باتیں بے وزن تھیں۔ جس شخص کی نصف زندگی خود سیاست میں گزری ہو جس نے "قبرستانوں" میں "اذانیں" دی ہوں۔ اس کا سیاست کے بارے میں یہ ذہن ایک لطیفہ تھا۔ یہ ذہن انہوں نے تحریکِ خلافت کے بیٹھ جانے پر زعمائی کہ قوت سے متاثر ہو کر قائم کیا تھا اور اس پر سختی سے قائم تھے۔ تقسیم ملک کے بعد تو وہ سیاست ہی کو منکرات میں سے سمجھتے تھے گو تحریک خلافت کے بعد بھی انہوں نے سیاست میں وافر حصہ لیا لیکن اپنی مرضی سے کم دوسروں کی مرضی سے زیادہ۔ ان کا ایک خاص معیار تھا جس سے حالات کے بجائے افراد کا جائزہ لیتے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ حالات کیا کہتے ہیں ان کے لئے بس یہ کافی تھا کہ احباب کیا کہتے ہیں، جب تک دوست ان کے اعتماد کو مجروح نہ کریں وہ ان کے دماغ سے بھی سوچ لیتے، ملک کی سیاسی تحریکوں کے اٹھانے میں ان کے دماغی فیصلے شاذ ہی شریک ہوتے لیکن ان تحریکوں کے جگمگانے میں ان کی زبان برقی لہر ثابت ہوتی۔

وہ سب سے بڑے عوامی خطیب تھے لیکن عوام کو کالانعام ہی سمجھتے۔ انہیں جدید سیاسی اصطلاحوں سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کا خیال تھا کہ تحریکات میں عوامی قوت فعال ضرور ہوتی

ہے لیکن سرچشمہ نہیں۔ وہ نتائج کو مشیت ایزدی کے تابع سمجھتے تھے ان کی بے نیازی حد سے بڑھی ہوئی تھی، انہیں اخبارات سے نفرت تھی ان کا عقیدہ تھا کہ اخبارات نے آغاز سے اب تک بڑے بڑے جھوٹ گھڑے ہیں، اگر اس جھوٹ کا بوجھ ماؤنٹ ایورسٹ پر پڑتا تو وہ زمین میں دھنس چکی ہوتی۔ انہیں اشتہار دینے یا بننے سے سخت نفرت تھی۔ ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انہیں بہلا یا پھسلا نہ سکی اور نہ وہ خوشامد ہی سے رام ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ انسان کی ملعون کمزوریاں تھیں۔ یہاں بڑے بڑے تخلیہ دوست رہنما اور گوشہ نشین مہاتما بھی اخباروں میں چھپنے کی آرزو سے بے نیاز نہ رہ سکے لیکن شاہ جی غالباً تنہا انسان تھے جنہیں اس کوچے سے رسم و راہ رکھنے میں عار تھی، وہ غصہ میں اکثر اس کو جہنم کی آگ کہہ اُٹھتے اور ہمیشہ اس سے کنی کتراتے رہے۔

"بابو! میں اس میدان کا کھلاڑی نہیں"

جب کسی فوٹو گرافر نے ان کی تصویر لینے چاہی تو چہرے پر رومال ڈال لیا یا ڈانٹ کر بٹھا دیا، کیا کرتے ہو میاں؟ یہ میری ہی تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں، میرے خیالات کو اُتار سکتے ہو تو دل کے فوکس میں اُتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہوگی۔ دنیا میں نہ سہی عاقبت میں کام آئے گی اور ہاں میری تصویر ——؟

بیٹا پاس بیٹھا ہو تو اس سے کہتے "کھڑے ہو جاؤ شاہ جی!"

فوٹو گرافر سے مخاطب ہو کر،

"میری تصویر میرا یہ بیٹا ہے اس کو دیکھ لو"

"اور ہاں میری نظر سے دیکھنا! کتنی اچھی تصویر ہے؟"

خود عمر بھر میں ایک آدھ تصویر کھنچوائی، اس کے علاوہ دو چار تصویریں اور ہوں گی لیکن سب چوری چھپے کی، وہ تصویر کا رکھنا اور کھنچوانا شرعاً ممنوع سمجھتے تھے۔ انہیں مصوری اور عکاسی کی خلقی اور غیر خلقی بحثوں سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ انہیں کٹ حجتی سمجھتے۔ عرض کیا کہ

فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت تھی) فرماتے:

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد تھا۔ شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب اقوال ہیچ ہیں"۔

اور وہ میاں کے لقب سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (فدا امی وابی) کا نام لیتے اور ذکر کرتے تھے۔

راقم نے عرض کیا:

"شاہ جی! آپ تو کرتے کے ساتھ شلوار پہنا کرتے تھے لیکن یہ کچھ دنوں سے آپ نے تہبند پہننا شروع کر رکھا ہے؟ فوراً ہی بات کاٹ لی:

"بھائی حضور کا لباس ہے، میاں پہنتے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد ہر سوال ختم ہو جاتا، شاہ جی کی دو تہائی زندگی سیاسیات میں کٹی، ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا، ان دنوں کے سوا جو قید خانے میں بسر ہوئے کوئی دن بھی تقریر کے بغیر نہ گزارا، سیکڑوں قومی و ملکی مسائل پیدا ہوئے اور ہر مسئلے میں لوگوں سے کہا سنا لیکن اخباروں میں بیان بازی سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں اور جب نامہ نگاروں نے گھیرا دامن چھڑا لیا، تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی میں ایک دلچسپ خموشی تھی۔ مجلسِ احرار نے اپنا اخبار جاری کیا لیکن وہاں بھی کبھی کوئی بیان نہیں چھپوایا جو بیان یا پیغام ان سے منسوب ہیں ان میں بھی ان کی منشا تھی، قلم نہیں، راقم کے علم میں صرف ایک مثال ایسی ہے جو اس سے مستثنیٰ ہے اور وہ ایک خط ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد روزنامہ "آزاد" میں ان کے قلم سے نکلا۔ تقریباً تمام بڑے ایڈیٹروں سے ان کے تعلقات رہے، لیکن چپنے چھپانے سے فرار ہی کیا۔ کسی نامہ نگار نے گھیر لیا، کوئی سٹاف رپورٹر آ نکلا

یاکسی نمائندے سے ٹکر ہوگئی اور وہ سوال کر رہا ہے، شاہ جی فلاں مسئلہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شاہ جی کنی کترا کے نکل جاتے، فرماتے:

"بھائی میں آجکل قرآن مجید کی فلاں آیت پر غور کر رہا ہوں، میرا خیال ہے فلاں فلاں مفسر نے اس بارے میں ٹھوکر کھائی ہے البتہ شاہ عبد القادر کے ترجمہ میں بات اُبھرتی ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر سامنے نہیں، غالباً انہوں نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔"

اخبار نویس پوچھتا ہے:

"دو قومی نظریے کے مسئلے میں آپ علامہ اقبالؒ سے متفق ہیں یا مولانا حسین احمد مدنی سے؟ آپ نے بحث تو دیکھی ہوگی؟ بھائی میں نے جانبین کے فرمودات کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ آج کل بیاض کھنگا لتے میں لگا ہوں۔ کوئی ۴۵ برس پہلے "جب آتش جوان تھا" یہ بیاض مرتب کی تھی۔ سنو یہ شعر کس قدر پیارا ہے۔

ہر کسے راد امن تر ہست امادیگران
بازمی پوشند و مادر آفتاب انداختیم

اخبار نویس کہتا ہے "شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟ جمہوریت اس وفاق کا ذریعہ بن سکتی ہے یا فسطائیت یا اشتمالیت؟

شاہ جی موڈ کے آدمی تھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ دیتے کہ انہوں نے عصری تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں؟ ان کے نزدیک ہر چیز کی ایک ہی ترازو ہے اور وہ ہے قرآن مجید اسوہ رسولؐ، سیر صحابہؓ اور علمائے اُمت کا فہم و تدبر۔ ان ائمہ اربعہ کے سوا جن کی فقہ چلتی ہے وہ کسی جدید فقہ کے قائل نہ تھے، ان کا واحد معیار اسلاف تھا۔ اس دور کی بیشتر تحریکیں ان کے نزدیک ذہنی بدکاری تھیں۔ انہوں نے سرے سے ان تحریکوں کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں ان کی معلومات محدود اور بالواسطہ تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی

کہ وہ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے اور عصری تحریکوں کا علم انگریزی میں رسوخ کے بغیر حاصل نہ ہوتا تھا۔ گو ایک حد تک انگریزی زبان کے مزاج سے آشنائی بھی اس خلا کو پورا کرتی ہے لیکن شاہ جی دونوں سے دست کش تھے۔

ان کا تعلق دیوبند کے اس مدرسۂ فکر سے تھا جس نے انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تھا وہ دیوبند کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن ان کی ذہنیت کا خمیر اسی خاک سے اُٹھا تھا جن اکابر علماء نے سرسید کے مشن کی مخالفت کی وہ ان پر ہزار ہزار رحمتیں بھیجتے۔ ان کے عقیدہ میں خرابی کی اصل جڑ انگریزی تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کے بدن سے "روحِ محمدؐ" نکال لی اور انہیں مغربی افکار کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا اس خرابی کو ابتداً روک لیا جاتا تو آج نقشہ مختلف ہوتا اور مسلمان اس طرح نہ گرتے جس طرح گر چکے ہیں پھر ان کا یہ خیال سراسر درست تھا کہ زبان کے بدلنے سے انسان بدل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربوں نے جن ملکوں کو فتح کیا وہاں کی زبان عربی بنا ڈالی اور عام باشندے اسلامیات میں گھل مل گئے۔ جہاں عربی زبان کا تسلط نہ ہوا وہاں جہانبانی کی مدت گزرتے ہی عمارت بیٹھ گئی۔ ہندوستان کی نظیر سامنے ہے۔ یہاں اسلام حکمرانوں کی معرفت نہیں بلکہ اہل اللہ کی وساطت سے آیا لیکن عام آبادی میں اسلامی فکر رچ بس نہ سکی۔ عربی اثر سے قاہرہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا شہر ہو گیا لیکن دہلی مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے باوجود اس شرف سے محروم رہا۔ جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی ان کا اسلام کئی واسطوں سے متاثر تھا وہ اسلام کی اصل زبان ہی سے ناآشنا تھے۔ فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی لیکن قبول اسلام کے باوجود اس میں مجمی رنگ برقرار رہا۔ اس کی کوکھ سے اُردو پیدا ہوئی جس نے خاص قسم کے اثرات پیدا کئے باوجودیکہ اس زبان کے بنانے اور بولنے والے مسلمان تھے لیکن زبان مسلمان ہو گئی۔ اسلام اُردو نہ ہو سکا۔ انگریزی کا معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اولاً نصاریٰ کی زبان، ثانیاً فاتحوں کی بولی، ثالثاً اسے وہ لوگ لے کر آئے تھے جو کلیسا کے ردِ عمل سے نفس مذہب کے خلاف اُبھرتی ہوئی تحریکوں کے ہراول تھے۔

حد یہ کہ صنعتی انقلاب نے زبان کا مزاج ہی بدل ڈالا ——— ان حالات میں جن علماء نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے روکا اور ان میں اس کے خلاف ایک عمومی تحریک کی نیو اُٹھائی۔ ان کے ذہن میں یقیناً حالات کی خرابیوں کا یہ نقشہ ہوگا لیکن اب دنیا ایک صدی آگے بڑھ چکی ہے اور آج انگریزی کو دنیا میں وہی عروج حاصل ہے جو کبھی عربی کو تھا۔ پھر انگریزی محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ سائنسی انکشافات کی طرح ناگزیر ہوگئی ہے لیکن شاہ جی کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا دونو حرام تھے۔

ایک دفعہ میں نے ان کے بچوں سے متعلق عرض کیا:

"شاہ جی انہیں انگریزی پڑھائیے، انگریزی مدرسوں میں بھیجئے اور ممکن ہو تو وکیل بنائیے آئندہ معاشرے کی باگ ڈور قانون دانوں کے ہاتھ میں ہے"۔

بس اس پر بگڑ گئے۔

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انہیں زندہ دفنا دو ——— لعنت بر پدرِ فرنگ۔

اور یہ ان کا قلندرانہ نعرہ تھا۔

کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی ایک خاص کھیپ سے ان کے دوستانہ مراسم تھے، ہندوستان ایک تھا تو ان کے نیاز مندوں میں بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ (ہندو اور مسلمان) شامل تھے۔ ان کی ایک بڑی جمعیت کو ہمیشہ آپ سے لگاؤ رہا، سبھی آپ کا احترام کرتے لیکن نہ وہ انھیں ہم خیال بنا سکے اور نہ یہ انہیں قائل معقول کر سکے۔ دونوں کے درمیان جذباتی رشتہ رہا۔ ان میں سے اکثر آپ کے صحبت یافتہ تھے، مثلاً منشی احمد دین سوشلسٹوں کے سب سے بڑے مقرر تھے ان کا سیاسی راستہ ہمیشہ ہی مختلف رہا لیکن خطابت میں شاہ جی ہی کے خوشہ چین تھے۔

شاہ جی کمیونزم کو بھی اسلام کے خلاف یہودیوں کی لامتناہی سازشوں کا ایک حصہ سمجھتے تھے دلیل یہ تھی کہ کارل مارکس یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ سے اسلام کے خلاف سازشیں

کرتے آئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ اسلام کے خلاف کی گئی سازشوں کی پوری تاریخ اپنے خطیبانہ جوش میں بیان کر جاتے۔ ان کی یہ باتیں نئی نسل کے لئے سطحی ہوتیں یا اجنبی یا پھر جذباتی لیکن ان کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا کہ سامعین متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔

کارل مارکس نسلاً یہودی ضرور تھا لیکن اس نے انسان کے اجتماعی اور انفرادی دکھ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کی اساس جدلیات پر ہے، صیہونیت پر نہیں، مگر شاہ جی تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی کش مکش، جدلیاتی اصول اور سرمایہ و محنت کے معاشی مباحث کو اپنی خطابت میں کوئی اہمیت نہ دیتے، فرماتے ؏

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

جس تحریک یا جماعت میں خدا نہ ہو، اخلاقی قدریں اضافی سمجھی جائیں اور پیغمبر صرف مادی حالات کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آئے ہوں، شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر نکتہ چینی کرتے، عام اشتمالی نوجوانوں کو گمراہ مگر مخلص خیال کرتے لیکن دکاندار علماء کی طرح وہ نہ تو سرمایہ داری کا جواز پیدا کرتے اور نہ بڑی زمینداریوں ہی کے حق میں تھے، فرماتے زمینیں خدا کی ملکیت ہیں اور جو لوگ ان میں ہل جوتتے ہیں وہی از روئے اسلام ان کے حقدار ہیں۔ جس نظام معیشت سے بھی استحصال پیدا ہو وہ اس کے سخت خلاف تھے انہیں خونیں انقلاب برپا کرنے میں کوئی عار نہ تھی لیکن ان کے نزدیک رہنما "قرآن" تھا "سرمایہ" نہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں دہلی دروازہ لاہور کے باہر حکومت الٰہیہ کے موضوع پر بول رہے تھے۔ جانے کیونکر اشتراکیوں کا ذکر آگیا، کسی نے لقمہ دیا، حضرت ان کا تو عقیدہ ہے کہ زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ بس پھر کیا تھا، گھنگھریالے بالوں کو جھٹکا دیا، پہلے ہنسے پھر تاؤ میں آگئے۔ "ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے، ہائے اکبر الہ آبادی کس وقت یاد آگئے ——— (لے کے ساتھ)

صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

کہاں خداوند ایزد متعال کے "کُن" کے لفظ سے کائنات پیدا کی کہاں روس، توسے پر دانۂ اسپند، اُلٹا دو تو سو رہو جائے"

بات کچھ نہیں محض الفاظ کا اُلٹ پھیر تھا لیکن اس ایک ادا نے مجمع کو گرویدہ کر لیا، نعرہ ہائے تکبیر گونج اُٹھے، اس سحر ہی سے خوفزدہ ہو کر ڈاکٹر اشرف نے ایک دفعہ شاہ جی سے کہا تھا "آپ لوگوں پر ایسا جادو کرتے ہیں کہ ان کے سوچنے کی قوتیں ماؤف ہو جاتی ہیں آپ کا علاج گولی ہے"

غرض شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ تھے، ان کی باتیں اکثر و بیشتر حقائق پر مبنی ہوتیں جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوتے تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہ بیٹھتیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتیں کہ لوگوں کو شاہ جی کے علیم ہونے کا گمان ہوتا۔ اُن کی قلندرانہ شوخیاں اکثر و بیشتر حقائق پر مبنی ہوتیں۔ یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہ تھی ان لوگوں میں جھنجھلاہٹ پیدا کرتی جو سیاست کو مادیات کے آئینے میں دیکھتے تھے لیکن اس جھنجھلاہٹ کے باوجود جب نتیجوں کی منزل سامنے آتی تو ان باتوں کا بہت بڑا حصہ صحیح ہوتا۔ خضر وزارت ٹوٹی تو ان کی قلندرانہ پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوتی گئیں۔

چڑھتے دن سے گئی رات تک وہ مکانوں سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کا نظارہ کرتے، کوئی پوچھ لیتا تو فرماتے:

"میاں کیا پوچھتے ہو؟ شعلے نہیں ٹوانوں کے طرّے ہیں طرّے"

شاہ جی نے فسادات کے آغاز ہی میں امرتسر چھوڑ دیا تھا، امرتسر سے کوئی دوست آتا تو اس سے کہتے۔ "وہاں کیا رکھا ہے چلے آؤ جو خط کھینچ چکا ہے وہ اب مٹنے کا نہیں" مجھے

دیکھو سخن متروکہ ہوگیا ہوں ع

کہ پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں پائے بند ترے

عمر بھر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے رہے لیکن ان دنوں وہ التزام بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اخبار مل گیا، پڑھ لیا۔ نہ ملا تو دوستوں سے خبریں معلوم کر لیں یا ریڈیو سُن لیا۔

ان کی سفری کائنات ایک چھوٹا سا بستر، ٹین کا بیمار بکس، بید کی ٹوکری، تانبے کا لوٹا اور گول سا پاندان تھا۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی تو جب تک پڑھ نہ لی شریک سفر رہی، ان دنوں "غبارِ خاطر" کا دستخطی نسخہ ہمراہ تھا۔ اس کا مطالعہ شروع کیا تو اپنی کہانی بھی کہنے لگے، حافظہ کی گرہیں کھلنے لگیں انہیں عربی، فارسی، اُردو، پنجابی اور ملتانی کے بے شمار شعر، مثنویاں، قصیدے، مسدسیں، مخمسیں، نوحے، نعتیں، غزلیں، نظمیں ازبر تھیں اور مولانا آزادؒ کی طرح اپنے حافظے پر انہیں بھی بڑا ناز تھا۔

"یہ اشعار آج سے کوئی تیس سال پہلے پڑھے تھے، فلاں شعر شاد عظیم آبادی سے سُنا تھا اب تک یاد ہے، نظیری کے فلاں فلاں شعر نانا مرحوم کے بیاض سے نقل کئے تھے میاں! فارسی کا ذوق تو اب عنقا ہو رہا ہے، ادھر اُردو بھی اب نئے نئے تجربوں کی زد میں ہے۔ شاعری نے ایک نیا بچہ جنا ہے، نظم معریٰ یا نظم آزاد، مرزا غلام احمد کی نبوت اور نظم معریٰ میرے لئے ناقابل فہم ہیں ——— لعنت بر پدر فرنگ!

مدت العمر پنجابی کی شوخ و شنگ شاعری کا شوق رہا۔ لیکن عمر کے ساتھ ہاتھ اُٹھا لیا۔ ایک دفعہ مولانا آزادؒ کو ہیر وارث شاہ کا ایک بند سنایا۔ اس وقت تو مولانا حاد تاً "ہاں" میرے بھائی کہہ کر چپ ہو رہے لیکن ۲۵ - ۲۶ برس بعد ملے تو فرمایا "شاہ جی سنا کہ آپ تقریریں گالی دینے لگے ہو؟"

"حضرت، آپ سے کس نے کہا؟"

"میرے بھائی، نام تو یاد نہیں آ رہا، بہرحال کوئی صاحب ضرور تھے۔"

"تو حضرت آپ نے اعتبار کیا؟"

"میرے بھائی اعتبار کی بات نہیں، ایک زمانہ میں آپ نے ہیر وارث شاہ کے چند شعر سنائے تھے ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے، میں نے سمجھا شاید زبان لڑکھڑا گئی ہو۔"

شاہ جی نے قہقہہ لگایا، مولانا نے تبسم فرمایا اور بات ہوا ہو گئی۔

انہیں بلھے شاہ کی کافیاں اور بابا فرید کا کلام بھی خوب یاد تھا بابا فرید کی زبان دو ضلعی ہے اور مقابلتہً دشوار۔ بلھے شاہ سریع الفہم ہیں اور ان کے ہاں کھلی صاف گوئی ہے ؎

سچ کہندیاں بھانبڑ مچدا اے

"ہاں بھائی سچ کہنا فرنگی کے دور میں بہت بڑا جرم ہے۔"

"جی نہیں شاہ جی ہر دور میں جرم رہا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بھائی لیکن ہمارا معاملہ تو اس دور سے ہے۔"

میں چاہتا تھا شاہ جی اس موضوع پر کھلیں اور میں ان پر بزعم خود ثابت کروں کہ انسان کو اس دور میں مقابلتہً زیادہ حقوق و مراعات حاصل ہیں اور پہلے تمام دور سیاستہً گھناؤنے اور ڈراؤنے تھے۔ میں نے ان سے کہہ ہی دیا، شاہ جی مسلمان بادشاہوں نے بھی تو راستبازوں کے کاٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی؟ آج جن لوگوں کو تاریخِ اسلام کی سب سے بڑی شخصیتیں کہا جاتا ہے ان کے ساتھ حکام اور عوام نے ایک سا برتاؤ کیا آج استبداد کی اجتماعی حمایت میں کم سے کم عوام تو شریک نہیں ہوتے؟

"میاں! یہ سب کچھ میں نے بھی پڑھا ہے، تم فرنگی بابا کو نہیں جانتے، اس نے روحیں قتل کر دی ہیں، روحیں! اسلام اٹھ گیا مسلمان رہ گئے۔ ہائے اکبر کس وقت یاد آیا دلے میں،

؎ یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے بھی اکبر الہ آبادی کی طرح احتجاجی لیکن منفی جذبات تھے لیکن دونوں میں

وہی فرق تھا جو ایک مصلح اور انقلابی میں ہوتا ہے۔ اکبر مسکرا کر چٹکی لیتے ہیں شاہ جی جھنجھلا کر تھپیڑ مارتے ہیں۔ ان کے دل میں ہمیشہ کے لئے یہ گرہ پڑ چکی تھی کہ انگریز سے بڑا دشمن اسلام کوئی نہیں۔ ان کے سامنے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی پوری تاریخ تھی۔ انہوں نے سیاسیات میں قدم رکھا تو پہلی جنگ عظیم کے نتائج آنکھوں کے سامنے تھے جو خیالات ورثہ میں پائے وہ استعمار کے مخالف علماء کے خیالات تھے۔ خلافت عثمانیہ جس طرح پارہ پارہ ہوئی اور عرب ملکوں میں قومیت کے نام پر جو گل کھلائے گئے وہ ان کی انگریزوں سے برگشتگی کے لئے کافی تھے۔ ہندوستان میں تحریکِ خلافت اور جلیانوالہ باغ کے حادثے نے مہمیز کا کام کیا۔ نتیجۃً شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ فرماتے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو راستہ دکھایا ہے آخرت کی فکر میں اُسی پر چل رہا ہوں مجھے اسی کے لئے جینا اور اسی پر مرنا ہے ؎

حرف ناگفتہ مجال نفسے مے خواہد
ورنہ مارا بہ جہاں تو سروکار کجاست

الغرض ان کی ذات ربع صدی تک انگریزوں کے خلاف ایک تحریک بنی رہی۔ اس لحاظ سے وہ ایک ادارہ تھے۔ انہوں نے ایسے علاقوں میں انگریز دشمنی کے بیج بوئے جہاں ان کے اپنے الفاظ میں اور گو یہ الفاظ کسی قدر سخت ہیں "پنجابی مائیں بڑی چاہت سے ٹوڈی بچے جنتی تھیں"

ایک دوست نے دریافت کیا ملکی سیاسیات میں آپ کی کارگزاری (Contribution) کیا ہے اور آزادیٔ ہندوستان کا وہ کون سا مثبت نظریہ ہے جس کے لئے آپ کوشاں ہیں؟ فرمایا "یہ فیصلہ تو آپ کیجئے کہ میری (Contribution) کیا ہے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ میں نے لاکھوں ہندوستانیوں کے ذہن سے انگریزوں کو نکال پھینکا۔ میں نے کلکتہ سے خیبر تک اور سرینگر سے راس کماری تک دوڑ لگائی ہے وہاں پہنچا ہوں جہاں

دھرتی پانی نہیں دیتی۔ رہا یہ سوال کہ آزادی کا وہ کونسا تصوّر ہے جس کے لیے میں لڑتا رہا تو سمجھ لیجئے کہ اپنے ملک میں اپنا راج۔ آپ غالباً مجھ سے کسی کتابی آئیڈیالوجی کا پوچھ رہے ہوں گے؟ بابو — یہ کتابی نظریے عموماً روگ ہوتے ہیں، فی الحال جو مرحلہ درپیش ہے وہ کسی مثبت تصور کا نہیں، منفی تصور کا ہے، ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ غیر ملکی طاقت سے گلو خلاصی حاصل ہو۔ اس ملک سے انگریز نکلیں۔ نکلیں کیا؟ نکالے جائیں، تب دیکھا جائے گا کہ آزادی کے خطوط کیا ہوں گے؟ آپ تو نکاح سے پہلے چھوہارے بانٹنا چاہتے ہیں۔ پھر میں کوئی دستوری نہیں سپاہی ہوں، تمام عمر انگریزوں سے لڑتا رہا اور لڑتا رہوں گا۔ اگر اس مہم میں سور بھی میری مدد کریں تو میں ان کا منہ چوم لوں گا۔ میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہوں جو "صاحب بہادر" کو کاٹ کھائیں۔ خدا کی قسم میرا ایک ہی دشمن ہے انگریز۔ اس ظالم نے نہ صرف مسلمان ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ہمیں غلام رکھا اور مقبوضات پیدا کیے بلکہ خیرہ چشمی کی حد ہوگئی کہ قرآن حکیم میں تحریف کے لیے مسلمانوں میں جعلی نبی پیدا کیا، پھر اس خود کاشتہ پودے کی آبیاری کی اور اب اس کو چہیتے بچے کی طرح پال رہا ہے۔"

ان کی اس جھنجھلاہٹ میں ایک قسم کی جارحانہ لگن ہوتی جو باتیں اقبال نے قلندرانہ رنگ میں کہی ہیں اور جن میں "پیچ و تاب رازی" اور "سوز و ساز رومی" کی شدت پائی جاتی ہے شاہ جی ان کے انتھک مفسر تھے، اقبال و اکبر کی مثالیں یہاں اس لیے زیر قلم آئی ہیں کہ قارئین شاہ جی کی سیرت کے اس پہلو کو آسانی سے سمجھ لیں۔

اکبر اور اقبال دونوں کا مشن ایک تھا، لیکن دونوں کا طرز بیان مقاصد میں ہم آہنگی کے باوصف مختلف رہا۔ اقبال کا انداز عقلی ہے، اکبر کا جذباتی — اکبر نے ایک گرتی ہوئی دیوار سے دل برداشتہ ہو کر گردو پیش کے ظواہر پر سنگ دلانہ قہقہے لگائے تھے لیکن اقبال اس دور کی تمام عصری تحریکوں کے نقاد تھے وہ انگریزوں کے صرف اسی لئے مخالف نہیں تھے کہ انہوں نے کسی مدرسۂ فکر سے عقیدے کے طور پر بعض معلوم سچائیاں حاصل کی تھیں ان کی

انگریزوں پر چوٹیں ایک مسلسل مطالعے اور لگاتار مشاہدے کا نتیجہ تھیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں سے

کرے قبول اگر دین مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

گویا اقبال کے علم و نظر کی معراج اس خیال پر ختم ہوتی ہے جس خیال کو شاہ جی کے ہاں قریب قریب عقیدہ کا درجہ حاصل تھا اور جو جذبہ سے شروع ہو کر جذبہ ہی پر ختم ہوتا تھا۔

شاہ جی کا یہ جذباتی سراپا انتہائی دلآویز تھا انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کی بنیاد محض اس اصل پر نہیں رکھی تھی کہ وہ ایک استعماری قوت تھی، اس کا نوآبادیاتی نظام استحصالِ محض تھا اور وہ دنیا کے سب سے بڑے سامراج کی مظہر تھی۔ ان کی بنیاد مخاصمت میں کچھ اور باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں مثلاً:

شورش صاحب کیا آپ بھی غدر کہتے ہیں

"۱۸۵۷ء کا غدر اور وہ اسے "غدر" کہنے والوں کو غدار کہتے۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی، شہزادوں کا خونی دروازوں پر لٹکایا جانا، آزاد قبائل کے پٹھانوں پر انگریزوں کی مسلسل بمباری، گیلی پولی کے مقام پر مصطفےٰ کمال کے خلاف گھڑوں، ٹوانوں اور نونوں کی نبرد آزمائی، قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کا بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جانا، غلافِ کعبہ کا جلنا، مہدی سوڈانی کا خرطوم کے صدر دروازے پر سولی پانا، اس کی لاش کا جلایا جانا اور راکھ کا اڑانا، شاہ عبدالقادر جیلانی کے بغداد پر گولہ باری اور حرم کے کبوتروں کا زخمی ہونا ——" ان سانحات کو قرآن و حدیث کا رنگ و روغن دے کر اس طرح بیان کرتے کہ ہزارہا لوگ گھنٹوں دم بخود بیٹھے رہتے اور ان کے اعجازِ بیان پر سر دھنتے تھے۔

"شاہ جی اپنی سوانح عمری ہی لکھیے؟"

"کس کے لیے؟"

"ہمارے لیے:"

"آخر تیس بتیس برس تم لوگوں میں جھک مارتا رہا ہوں۔ اس سے تم نے کیا حاصل کیا جواب چند اوراق کی کہانی سے حاصل کر لو گے؟"

"اچھا اپنے لیے لکھیے۔"

"میں لکھی لکھائی کہانی ہوں، اپنے تئیں ہر روز پڑھ لیتا ہوں۔"

بہرحال شاہ جی اس طرح ایک تاریخ ہو جائے گی۔"

"پھر وہی بات، تاریخ کیا؟ اور کس کے لیے؟ پہلے ہی لوگوں نے تاریخ سے کون سا سبق لیا ہے کہ اب اپنی زندگی لکھنے بیٹھوں؟"

"شاہ جی یہ "زبان" کا نہیں "قلم" کا زمانہ ہے!"

"ٹھیک ہے بھائی! لیکن لکھوں کیا؟"

"کچھ تو کہیے کہ زمانہ گوش برآواز ہے۔"

"ہائے ذوق ہماری سوانح عمری تو اس شعر میں کہہ گیا ہے (رئے میں) ؎

لائی حیات، آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

"چلیے اسی شعر کو طراز عنوان بنا کر بسم اللہ کیجیے۔"

"خوب! آخر صحافی ہو نا؟ قلم اٹھایا اور صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالے، زندگی میں محض سوانح ہی نہیں ہوتے؟ کچھ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں؟ بعض گفتنی بعض ناگفتنی۔ ناگفتنی میں کام کی کوئی چیز نہیں اور گفتنی میں خطرات ہی خطرات ہیں ؎

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بدم پختہ شدم سوختم

آج سے چوتھائی صدی پیشتر ایک سفر شروع کیا تھا۔ تب بے شمار لوگ شریک راہ تھے۔ ہر پڑاؤ پر قافلہ گھٹتا ہی رہا حتیٰ کہ:

منزل عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کے اِس راہ میں آخر اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

کچھ دوست راستہ بدل گئے کچھ اپنے ہی تعاقب میں پیچھے لوٹ گئے، اکثر بچھڑ گئے، بیشتر پچھڑ گئے سے

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہِ ما دشمن خویش است

دوستوں سے فریب نہیں کیا، دشمنوں سے انتقام نہیں لیا۔ ذاتی دشمن بنائے ہی نہیں اور نہ بننے کی کوشش کی۔ جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو گیا کہ انگریز دوست ہے اس سے کنارہ کیا۔ جس نے ملی مقاصد سے بدعہدی کی اس سے علیک سلیک کو بھی عار سمجھا، اب اس عمر میں لوگوں اور شہروں کے خمیر و ضمیر سے واقف ہو گیا ہوں ؏

ان کو بہت قریب سے پہچانتا ہوں میں

اور جب اُمید نہیں تو شکایت کس سے ؟ ؏

مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میدان رفتم

صد بیابان بگزشت و دگرے در پیش است ——— اس سارے سفر کا حاصل ہے لگاتار چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ غاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اُٹھتے، چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں، سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کے لئے طوفان بکنار ہو جاتے، درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے، کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں، صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی، دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے، جنگل لہرانے لگتے، صحرا سرسبز ہو جاتے، افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں ——— جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے،

جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا، جن کی پستیاں انتہائی خطرناک تھیں جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گزر جانا طرب ناک تھا، جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے، تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں کی کہانی ہے، انہی چھچھورے، ناسمجھ، نازک اور متحرک جانوروں کو دیکھ کر زرتشت نے کہا تھا کہ اس کا آنسوؤں اور گیتوں کی طرف میلان ہوتا ہے ——— یہاں امرا۔ دوزخ کے کتے اور سیاست دان کھٹی قے ہیں، ان کے ساتھ نٹ اور ان کے پیچھے لاشیں چلتی ہیں ان کی واحد خوبی یہ ہے کہ ہر نیکی اور ہر برائی کی زبان میں جھوٹ بول لیتے ہیں۔"

میاں بابو! ڈھونڈ سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں ڈھونڈ لو۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

اور نظیہ ظاہر گرامی کا یہ مصرع بھی اسی اجمال کی شرح ہے ع

زدی کشتی شکستی سوختی انداختی رفتی

الغرض انہیں اپنی ناکامیوں کا شدید احساس تھا اور اس آزردگی کے آثار آخر عمر میں ان کے چہرے پر آگئے تھے، ان کی متحرک اور روشن آنکھیں جن میں عمر ڈھلنے تک ساری مستی شراب کی سی تھی بالآخر اندر کو دھنس گئی تھیں، ان کے ماتھے کی بے شمار سلوٹوں میں ہزیمت کی ترشی منجمد ہو گئی تھی اور سلوٹیں اپنے ماضی کے بوجھ سے مضمحل تھیں، آواز میں کراراپن آخر تک رہا لیکن کمر کی خمیدگی پکار رہی تھی ع

لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

۱۹۴۷ء کا زمانہ رستخیز سب سے طویل عرصہ تھا جو انہوں نے ایام قید سے قطع نظر ایک ہی جگہ نشست جما کر بسر کیا، چند ماہ دفتر احرار میں رہے اور اس اثنا میں کتاب کے جتنے ورق تھے ایک ایک کر کے کھل گئے۔ وہ اپنی کہانی لکھتے تو حقیقتہً بڑے بڑے وقائع نگاروں کا اثاثہ مفلس کا چراغ ہو جاتا۔ انہوں نے ہندوستان کا ہر کونہ کھدرا چھان مارا۔

وہ بعض صوبوں ہی کی نہیں بلکہ شہروں، قصبوں، گاؤں اور بازاروں تک کی بولی ٹھولی محاورہ روزمرہ جانتے تھے۔ انہوں نے انگلیوں پر گنی ہوئی کتابیں پڑھی ہوں گی لیکن انسان اتنے پڑھے تھے کہ ہندوستان میں کوئی بڑے سے بڑا عوامی لیڈر بھی اس خصوصیت میں ان کا ہمسر نہیں تھا۔ اس دوڑ میں وہ مہاتما گاندھی اور قائداعظمؒ سے بھی منزلوں آگے تھے لیکن گاندھی جی کے الفاظ میں تالیاں پیٹنے والے مسلمان ان کے ساتھ تھے اور ووٹ دینے والے قائداعظمؒ کے ساتھ۔ انہیں ہندوستان کی بہت سی زبانوں پر قدرت حاصل تھی، ہزاروں لطائف یاد تھے۔ حاضر جوابی اور برجستہ گوئی میں اتنے مستعد کہ ان سے کئی کتابیں مرتب ہوسکتی تھیں۔ پنجاب کی بعض اضلاع کی بولیاں رگ وپے میں خون کی طرح دوڑتی تھیں۔ ان کی گفت گو سے یہ پہچاننا مشکل تھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ اُردو بولتے تو اہل زبان کا لب ولہجہ کچلا جاتا۔ قرآن پڑھتے تو قرآت سے عرب ہونے کا دھوکا ہوتا۔ پنجابی بولتے وقت منہ سے موتی جھڑتے، غرض ہر رنگ کی بولی ٹھولی نوک زبان تھی ؎

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

اکثر شخصیتوں کے قرب سے ان کا ملمع اُتر جاتا ہے لیکن شاہ جی کے قرب سے ان کا سونا اور دمکتا، وہ بے پناہ تھے۔ ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہوگئی تھیں۔

راجندر بابو نے گاندھی جی کے سوانح عمری کے دیباچے میں لکھا ہے:

"ان کے حالات زندگی لکھنا ایسا ہے جیسے تیرتھ یاترا"

شاہ جی تیرتھ نہ تھے لیکن ان کی یاترا سے ایک ایسے تیرتھ کا احساس ضرور ہوتا تھا جس میں صدیوں سے ایک ہی آوازہ گونج رہی ہو ؎

تیز رکھنا سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

خاندانی حالات

نام ونسب

نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ شاہ بخاری، ننھیال کی طرف سے شرف الدین احمد باپ کا نام ضیاء الدین احمد (رحمۃ اللہ علیہ) دادا کا نام نور الدین احمد (نور اللہ مرقدہ) پردادا کا نام سید محمد شاہ۔ ان سید محمد شاہ کے پانچ بیٹے تھے، دو لاولد رہے تین کے اولاد ہوئی۔ شاہ جی کے دادا کے ایک بھائی سید حیدر شاہ کا ایک بیٹا سید مقیم شاہ بنگال پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا، اس کے پاس خاندان کا شجرہ محفوظ تھا لیکن برعظیم کے بٹوارے میں حوادث کی نذر ہو گیا، معلومات ذیل کچھ تو افراد خاندان کی فراہم کی ہوئی ہیں اور کچھ منشی محمد دین فوق کی تالیف "تاریخِ کشمیر" سے ماخوذ ہیں۔

شاہ جی کا سلسلہ نسب ۳۹ ویں پشت میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ سید عبد الغفار بخاری اپنے والد ماجد سید محمد شاہ بخاری کے ہمراہ بخارا سے کشمیر میں وارد ہوئے، اس وقت کشمیر میں مسلمانوں کی فرمانروائی تھی۔ اپنے علم و تدبر کی بدولت سید عبد الغفار شاہ بخاری درس و قضا کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور بڑا نام پایا۔ سید عبد الغفار امام حسنؓ کی چوبیسویں اور شاہ عبد القادر جیلانی بغدادی کی تیرھویں پشت سے تھے۔ انہی شاہ صاحب کے خویش کشمیر سے اُٹھ کر گجرات اور امرتسر میں آباد

ہو گئے، پھر بیعت و ارشاد کے سلسلے میں دہلی سے پٹنہ چلے گئے اور وہاں لوگوں کی عقیدت مندی کے باعث سکونت اختیار کر لی۔ فی الجملہ ایک خاندان کئی شاخوں میں منقسم ہو گیا۔

شاہ جی کے فرزند ارجمند سید ابوذر بخاری (سید عطاء المنعم بخاری) نے اپنے والد کے مجموعہ کلام "سواطع الالہام" میں دیباچہ کے تحت خاندان کے حالات پر جو اشارات مرتب کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں، مثلاً شاہ عبدالقادر جیلانی (بغدادی)، جنہیں عراق میں پیر ہندیاں کہتے ہیں اور یہاں ان کے نام سے گیارہویں شریف ہوتی ہے۔

سید اکمل الدین محمد بخاری اس خاندان کے پہلے فرد تھے جو تلاش مرشد کے سلسلہ میں دہلی گئے اور وہاں سید غلام علی شاہؒ سے بیعت ہو کر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ضلع گجرات موضع سرہالی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ انگریزی عملداری کے وقت نقل مکانی کر کے اس ضلع کے ایک دوسرے گاؤں ناگڑیاں چلے گئے تب سے اب تک یہ خاندان وہیں آباد ہے۔ سید اکمل الدین محمد بخاری کا وصال امرتسر میں ہوا تھا۔

شاہ جی کے دادا نورالہ بن شاہ بخاری حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے، کہا جاتا ہے کہ نورالدین شاہ بیعت کے لئے سیال شریف پہنچے تو خواجہ صاحب تعظیماً کھڑے ہو گئے، کچھ دنوں مہمان رکھا پھر پروانہ خلافت اور سند ارشاد دے کر رخصت کیا۔

اتفاقات حسنہ ملاحظہ ہوں کہ شاہ جی کے دادا سیال شریف سے بیعت تھے اور حضرت سید مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف بھی وہیں سے بیعت تھے۔ شاہ جی نے اولاً سید مہر علیشاہ سے گولڑہ میں بیعت ارشاد کی تھی۔

شاہ جی کے اعزہ میں سے ایک صاحب سید ہارون شاہ کا بیان ہے کہ ہمارے بزرگ بخارا سے کشمیر پہنچے، وہاں برسوں قیام کیا پھر پنجاب چلے گئے، پنجاب سے کاروبار کیلئے دہلی اور پٹنہ کا رُخ کیا اور وہاں آباد ہوتے گئے۔

سیّد نورالدین شاہ کے ہزاروں مُرید تھے وہ کسی مرید سے پھوٹی کوڑی نہ لیتے، خود کماتے اور کھاتے، انگریزوں نے پنجاب پر قابض ہونے کے فوراً بعد زرعی نظام کی تنظیم جدید کے لئے زمینوں کی پیمائش کرائی تو ایک اہل کار نے جو آپ کے روحانی کمالات سے متاثر تھا عرض کیا آپ جتنی زمین چاہیں اس پر قبضہ کر لیں، اندراجات میرے سپرد ہیں، آپ کے حسب منشا خانہ پُری ہو جائے گی لیکن شاہ صاحب نے انکار کیا اور فرمایا: تمام زمینیں اللہ کی ہیں، ان پر ذاتی ملکیت کی مُہریں لگوانا شرعاً ناجائز ہے۔ اُن کے سرہالی چھوڑ کر ناگڑیاں میں آباد ہونے کا باعث بھی یہی تھا کہ اس وقت بہت سے لوگوں نے اس طرح جھوٹ موٹ سے زمینیں حاصل کی تھیں۔

شاہ جی کا ننھیال

شاہ جی کی والدہ سیدہ فاطمہ اندرابی حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی تھیں۔ حکیم صاحب طبیہ کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور مروجہ علوم میں دست گاہ رکھتے تھے۔ علم دین سے گہرا لگاؤ تھا۔ آواز میں قدرت نے جادو بھر دیا تھا، شاہ جی ان کی آواز کے سحر کا ذکر بڑے مزے سے کرتے اور فرماتے کہ میرے گلے کی دلفریبی نانا ہی کا صدقہ ہے۔ سیّد ابوذر بخاری کا بیان ہے کہ اندرابی خاندان سے خاندانی تعلقات کشمیر ہی سے چلے آ رہے تھے۔ شاہ جی کے والد سیّد ضیاء الدین ابھی نابالغ ہی تھے کہ اپنے نانا سیّد پیر شاہ بخاری اور اپنے چچا سیّد حیدر شاہ بخاری (والد سیّد مقیم شاہ بخاری) کے ہمراہ پشمینہ کی فروخت کے لیے پٹنہ جاتے تو ان حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرتے، حکیم صاحب نے ایک روز سیّد ضیاء الدین کو اپنی فرزندی میں لے لیا اور اپنی بیٹی فاطمہ اندرابی سے ان کی شادی کر دی۔ ان دنوں رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، سیّد ضیاء الدین نے چوک بازار پٹنہ کی مسجد خواجہ عنبر میں اپنی کمسنی کے باوجود ایک ہی رکعت میں ۲۶ پارے ختم کیے اور مقتدیوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کی یادداشتوں میں

درج ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی سارڈھستی کے بعد پٹنہ میں مقیم تھے وہاں انہوں نے سید ضیاء الدین سے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۹ سال تھی ایک رات ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پاک سنا تھا۔

شاہ جی کے ننھیالی سلسلے میں سب سے پہلے میر سید عبدالسبحان اندرابی نے ڈوگرہ راج کے ظلم سے عاجز آکر ترک وطن کیا اور کچھ دنوں شاہ جی کے بزرگوں کے ساتھ ان کے گاؤں میں ٹکے رہے۔ پھر پٹنہ چلے گئے، ان میر سید عبدالسبحان ہی کی پوتی شاہ جی کی والدہ تھیں۔

سید فاطمہ اندرابی کی والدہ (شاہ جی کی نانی) حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی نواسی تھیں۔

خواجہ باقی باللہ

حضرت خواجہ باقی باللہ کا مرتبہ ہندوستان کے اہل اللہ میں بہت ہی بلند ہے۔ کل اکتالیس برس کی عمر پائی لیکن اپنے پیچھے جو ورثہ چھوڑا اس پر کئی عمریں قربان کی جاسکتی ہیں۔ کابل میں پیدا ہوئے۔ اصل نام رضی الدین تھا لیکن باقی باللہ کے نام سے شہرت پائی ——— آپ کے والد قاضی عبدالسلام اہل علم میں سے تھے۔ بیٹے کو بھی اسی ڈگر پہ ڈالا۔ پہلے خود پڑھاتے رہے پھر ملا صادق حلوائی کے تلمذ میں دے دیا۔ ملا صاحب کابل چھوڑ کر ماوراالنہر چلے گئے تو خواجہ بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ایک مجذوب کی بدولت کتابوں سے ہاتھ اٹھایا اور مرشد کی تلاش میں نکل گئے فقراء و مشائخ کے عروج کا زمانہ تھا۔ کچھ عرصہ ماوراالنہر کے مشائخ کی صحبت میں رہے مگر گوہر مقصود نہ پایا۔ اسی اثنا میں امیر عبداللہ بلخی سے فیضان حاصل کیا اور طبیعت میں استقامت نے راہ پائی۔ مگر داخلی اضطراب جوش پر رہا۔ آخر ہندوستان پہنچے۔ یہاں کشمیر میں بابا بھائی کشمیری سے فیض حاصل کر رہے تھے کہ مرزا یادگار نے بابا صاحب کو زہر دلوا کر مروا ڈالا۔ چار و ناچار دہلی کا قصد کیا۔ وہاں چشتیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں قیام فرمایا اور حضرت شیخ کے فرزند خواجہ قطب العالم سے رجوع کیا۔ ایک رات حضرت قطب العالم پر منکشف ہوا کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کو مشائخ بخارا بلاتے ہیں، آپ نے فوراً ہی انہیں مطلع کیا اس وقت

خرقہ موجود نہ تھا۔ ایک ازار بختی دہ دے کر روانہ کر دیا۔ خواجہ صاحب بخارا پہنچ کر خواجہ امکنگی کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے آپ کو محنت اور توجہ سے نقشبندی سلسلے کی تعلیم دی اور فرمایا کہ ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے وہاں جاؤ اور خلق خدا کو فیض یاب کرو۔ خواجہ سمرقند سے پشاور پہنچے۔ وہاں سے لاہور، جہاں سال بھر قیام کیا اور دہلی چلے گئے۔ وہاں فیروز شاہ کے قلعے میں مقیم ہوئے۔ اکبر کا آخری دور تھا اور آپ بھی کچھ زیادہ عمر لے کر نہ آئے تھے فوراً ہی دربار اکبری کی بدعات روکنے کے لئے مفاہمانہ لیکن مضبوط اور مختلف قدم اٹھایا۔ نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اہل دربار سے بگاڑ مناسب نہیں، فی الحال ان سے تعلق پیدا کر کے ہی درباری گمراہیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ افسوس عمر نے وفا نہ کی چار پانچ سال کام کیا ہوگا کہ سفر آخرت پیش آگیا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی ملت اسلامیہ کو جو فیض پہنچا اس کی نظیر پورے ہندوستان میں نہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی آپ ہی سے بیعت تھے۔ حضرت مجدد نے تا حین حیات آپ سے فیض حاصل کیا جس کا اعتراف انہوں نے اپنے مختلف مکاتیب میں کیا ہے۔ بعض امرائے سلطنت بھی آپ کے مریدوں میں سے تھے جن سے سلسلہ چشتیہ کو کما حقہ فائدہ پہنچا۔ مثلاً،

۱۔ شیخ فرید الدین شہنشاہ اکبر کے عہد میں ڈیڑھ ہزاری منصب سے دیوان تن کے عہدہ پر پہنچے، کئی مہمیں سر کیں، جن میں افغانوں کی سرکوبی، کشمیر کی فتح اور اسیر گڑھ کا محاصرہ نمایاں ہیں۔ جہانگیر کی تخت نشینی پر شیخ کا مرتبہ اور بڑھ گیا۔ حتیٰ کہ تمام اعیان سلطنت میں بازی لے گئے۔ صاحب سیف و قلم کا خطاب ملا۔ ڈیڑھ ہزاری سے پنج ہزاری ہو گئے۔ شہزادہ خسرو کو شکست دی۔ جہانگیر نے خوش ہو کر نواب مرتضیٰ خان کا خطاب دیا اور گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ کوئی چار سال بعد پنجاب کا گورنر بنایا۔ آخر اسی عہدے پر پٹھانکوٹ میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وصیت کے مطابق دہلی میں دفن کیے گئے۔ آپ ان اکابر سلطنت میں سے تھے جنہیں قدرت اقتدار کے ساتھ فقر بھی عطا کرتی ہے اور جن کی درویشانہ فیاضیاں اس زمانہ میں زبان زد عام تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے حضرت خواجہ باقی باللہ کی روایت سے لکھا

ہے کہ شیخ فرید کے حقوق ہم سب پر ثابت اور مقرر ہیں کیونکہ ان سے نقشبندی جمعیت کو استحکام حاصل ہے۔

۲۔ قلیچ خان حاکم پنجاب جس کی بیٹی سے اکبر کا بڑا لڑکا دانیال بیاہا ہوا تھا ہر روز کوئی گھنٹہ بھر فقہ و تفسیر کا کھلا درس دیتا۔ اہل لاہور اس کی وسعت نظر اور فراخدلی کے گرویدہ تھے۔

۳۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں جو بیرم خان کے بڑھاپے میں بمقام لاہور پیدا ہوا۔ اس کی علم دوستیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں — ہر کوئی ان سے آشنا ہے۔

۴۔ مرزا حسام الدین جن کے والد کی بابت بدایونی نے لکھا ہے کہ دربار اکبری میں سجدۂ زمین بوسی کا بانی تھا۔ شیخ مبارک کا داماد اور ابوالفضل و فیضی کا بہنوئی تھا اس کو باپ کی وفات پر موروثی منصب ملا۔ خانخاناں نے بہتیرا روکا لیکن دیوانہ ہو کر گلی کوچوں میں گھومنے لگا۔ کچھ دنوں بعد دہلی کا قصد کیا وہاں باقی باللہ سے بیعت کی جب حضرت خواجہ اللہ کو پیارے ہو رہے تھے تو آپ کی خدمت میں حاضر تھا۔ حضرت خواجہ کے دونوں بیٹے خواجہ کلاں اور خواجہ خورد آپ کی وصیت کے مطابق حضرت مجدد الف ثانی کے حلقۂ رشد میں تھے لیکن ان کی عام خبر گیری کے فرائض مرزا حسام الدین کے سپرد تھے۔ انہی خواجہ خورد سے شاہ ولی اللہ کے والد شیخ عبدالرحیم نے چند سبق پڑھے تھے اور فیض حاصل کیا تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالنبی صدر الصدور بھی حضرت خواجہ باقی باللہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔

شیخ قطب عالم کے ذکر میں آچکا ہے کہ ان کے والد حضرت شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں حضرت خواجہ نے کچھ دن گزارے اور شیخ قطب عالم سے استفادہ فرمایا۔ انہی شیخ قطب عالم کے فرزند شیخ رفیع الدین کا دہلی سے باہر اعظم پور میں نکاح تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت خواجہ شریک ہوں۔ آپ نے ضعف و علالت کے باعث معذرت چاہی۔ شیخ نہ مانے، کہنے لگے آپ نہیں آئے تو میں شادی نہیں کروں گا؟ راضی ہو گئے، نکاح پڑھایا۔ اس زوجہ سے شیخ رفیع الدین کے ہاں جو بیٹی پیدا ہوئی اسے شاہ ولی اللہ جیسا یگانۂ عصر بیٹا عطا ہوا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ خون نسلاً بعد نسلٍ ہوتا ہے غلط نہیں، بعض خصائص فی الواقعہ قدرت کاملہ کی طرف سے اہل اللہ کی اولاد کو جزواً یا کلاً ودیعت ہوتے ہیں۔ اس مادی دنیا میں روحانی تصرفات کی یہ باتیں بظاہر عجیب و غریب نظر آتی ہیں لیکن بہر حال توثیقی آثار و مظاہر موجود ہیں۔ شاہ جی اور ان کے بزرگوں کی زندگی میں اکثر باتیں آج بھی ایک گونہ مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں پہلے پہل جن بزرگ سے تعلق پیدا کیا وہ

۱۔ خواجہ عبید اللہ احرار تھے۔ آپ نے سلسلۂ الاحرار کے نام سے رباعیات بھی لکھی ہیں جن میں سے ایک رباعی یہ ہے ؎

این سکہ کہ من زدم بنام فقراست
وین روشنی از نور تمام فقراست
برخیز ورہِ خواجۂ احرار بگیر
کان راہ زسرحد مقام فقراست

شاہ جی سراپا احرار اور احرار ان کی تمام زندگی کے برگ و بار تھے۔

۲۔ خواجہ باقی باللہ علوم متداول حاصل کر رہے تھے کہ ایک مجذوب صدا دیتا ہوا گزرا ؎

درکنز و ہدایہ نتواں دید خدا را
آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

خواجہ نے کتابوں کو طاق پر رکھا اور کتاب دل سے معاملہ کر لیا۔ حضرت شاہ صاحب بھی کسی باقاعدہ مدرسہ کے طالب علم نہ تھے اور نہ علوم متداولہ ہی میں سند یافتہ تھے لیکن "آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست" سے بہرۂ وافر پایا تھا۔

۳۔ حضرت خواجہ نے مرشد کے ارشاد پر لاہور میں سال بھر قیام کیا اور ہمیشہ خلفاء پر زور دیتے رہے کہ پنجاب میں ارشاد و ہدایت کا بیڑا اٹھائیں چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی کو اوّل اوّل لاہور ہی کے لئے نامزد فرمایا جو آپ کے وصال تک لاہور ہی میں مقیم تھے۔

شاہ جی نے بھی تبلیغ کی ساری عمر پنجاب میں گزاری۔ حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور پانچ سو علماء نے انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ منعقدہ لاہور میں آپ سے بیعت کی اور اسی جلسہ میں آپ کو امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت خواجہ نے اپنے ملفوظات میں حضرت مجدد الف ثانی کو لکھا ہے۔

"اگر سخن (وعظ) کا اتفاق ہو تو بہ طور علما کے کہنا بطور صوفیا کے نہیں"

شاہ جی کی ساری زندگی اس کا آئینہ رہی، وہ علم و تصوف کا سیاسی مرقع تھے، ان میں حضور سے غیب، عین سے علم، اور شہود سے استدلال کی رنگا رنگی سمٹی ہوئی تھی۔ لیکن ان میں سلوک و طریقت کے وہ طریق بالکل نہ تھے جن سے مشیخت کو آب و دانہ ملتا ہے۔

خواجہ (نور اللہ مرقدہ) کا مقولہ ہے کہ حاصل سلوک تہذیب الاخلاق ہے، شاہ جی عملاً اس قول کا عکس تھے۔ فرق یہ تھا کہ زمانہ سابق میں مشائخ و علما کے حدود و فرائض اب سے مختلف تھے۔ کبھی اصلاح احوال مقصود تھا۔ شاہ جی کے زمانے میں انقلاب احوال مقصود رہا۔

غرض ہر دور میں اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد فقر و استغنا میں ممتاز تھا اور حسب توفیق فکر و نظر کی لادینی کے خلاف جہاد کرتا رہا۔

ولادت

شاہ جی یکم ربیع الاول ۱۳۱۰ ہجری (۱۸۹۱ عیسوی) کی چاند رات کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے کہ والدہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ شاہ جی کی بیٹی ام کلثوم نے اس کتاب کی اشاعت اول کے بعض مندرجات پر مولف کی بیوی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ

"دادا مرحوم (شاہ جی کے والد) نے بیٹے کو ۹ برس کی عمر تک خود ہی پالا پوسا اور خواجہ عنبر کی مسجد میں اپنے ساتھ سلاتے رہے پھر جب ابا جی کی عمر نو اور دس برس کے درمیان ہوئی تو دادا جی نے پنجاب آکر دوسرا عقد کیا۔ ہماری یہ دادی رشتہ میں پردادا کی بھتیجی تھیں۔ مختصر عرصہ بعد دادا واپس پٹنہ گئے وہاں ہماری ان دادی صاحبہ کے بطن سے ایک چچا

اور ایک پھوپھی پیدا ہوئے، چچا بفضل تعالیٰ حیات ہیں اور گجرات میں بزازی کی دکان کرتے ہیں۔ پھوپھی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، چچا کا نام سید عطاء الرحمٰن بخاری ہے۔

اباجی کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی کہ دادا جان کے ہمراہ ۱۹۱۳ء میں پنجاب آ گئے۔ دادا جان نے تو اپنے آبائی گاؤں ناگڑیاں (ضلع گجرات) میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۹۱۹ء میں واصل بحق ہوئے لیکن ابا جان نے ۱۹۱۴ء سے امرتسر میں قیام کیا اور وہیں کے ہو گئے۔ پاکستان بن رہا تھا کہ امرتسر سے اُٹھ کر لاہور آ گئے اور دو چار ماہ لاہور میں قیام کیا پھر نوابزادہ نصر اللہ خان کے گاؤں خان گڑھ چلے گئے وہاں چند مہینے قیام کیا پھر ملتان میں آ کر آباد ہو گئے اور وہاں ۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ (۲۱ اگست ۱۹۶۱ء) کو چھ بجے شام واصل بحق ہو گئے۔ کل من علیہا فان۔

تعلیم و تربیت

شاہ جی کسی بھی روایتی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہ تھے، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مادر زاد عبقری ہوتے اور جن کی تربیت، مبداء فیاض کرتا ہے اس ضمن میں چند باتیں واضح ہیں۔ مثلاً

(۱) شاہ جی کے ننھیال اور ددھیال میں پنجاب اور بہار کا جغرافیائی فاصلہ تھا۔

(۲) وہ اپنے ننھیال کی اکلوتی بیٹی کے فرزند تھے، ان کی والدہ رحلت کر گئیں تو ان کی عمر چار سال تھی۔ نانی اماں نے آغوش میں لے لیا۔ ان حالات میں وہ بہمہ وجوہ مدرسہ کی تعلیم سے محروم ہو گئے۔

(۳) ایک تو حالات حسب حال نہ تھے دوسرے والدہ کی وفات سے پیش آمدہ حالات کے نتیجہ میں مدرسہ کی تعلیم کا ہاتھ آنا مشکل ہو گیا تھا۔

(۴) انگریزی مدرسوں میں ان کے داخلہ کا سوال ہی نہ تھا کیونکہ جس خاندان سے متعلق تھے وہاں انگریزی مدرسوں میں داخلہ خارج از بحث تھا۔

⑤ اس زمانہ میں ایک خاص عمر تک شرفاء کے بچے گھروں ہی میں تعلیم حاصل کرتے اور بڑی بوڑھیوں سے زبان و محاورہ سیکھتے تھے۔

شاہ جی کی بیٹی سادہ بانو (اُم کفیل) نے مولف کی اہلیہ کو لکھا ہے:

"ابا جی کا ادبی ذوق ننھیال ہی کی مجالس میں نکھرا تھا، فرماتے ماموں اور ہم بیٹھ جاتے۔ کبھی رات تک بیت بازی ہوتی، فارسی کتابیں ننھیال ہی میں پڑھیں، خواجہ عنبر کی مسجد میں ایک مُلّا تھے (نام بھول گیا) ان سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، پنجاب آگئے تو گھر سے نزدیک موضع راجووالی میں قاضی عطا محمد کے ہاں پڑھنے جاتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں امرتسر کی سکونت اختیار کی تو وہاں حضرت مولانا نور احمد سے تفسیر قرآن پڑھی، مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی سے فقہ اور حضرت مفتی محمد حسن سے حدیث (مسلم) پڑھتے رہے، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی سے بھی استفادہ کیا۔ قرآن پاک دادا جی سے حفظ کیا۔ دادا دو یا تین بجے شب جگا دیتے، دو پارے منزل سنتے اور سلا دیتے پھر نمازِ فجر کے لئے اُٹھاتے، نماز پڑھ چکتے تو سبق ہوتا۔

خلیفہ عبدالحمید (سلطان ترکی) کی اولاد کے اتالیق کویت کے ایک قاری سید محمد عمر عاصم کسی وجہ سے سلطان کی خفگی کا شکار ہو کر ہندوستان آگئے۔ پٹنہ میں قیام کیا اور خواجہ عنبر کی مسجد میں قرآن پاک پڑھانے لگے، غضب کے خوش الحان تھے۔ تلاوت کرتے تو مسجد کے دروازہ پر مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھیڑ لگ جاتی۔ ہندو دیویاں ان سے بچوں کو دَم کراتیں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا۔ اس زمانہ کے رؤساء دسترخوان پر بٹھاتے انہیں آنکھوں پر بٹھایا اس وقت شاہ جی عمر کے ابتدائی سفر میں تھے ایک دن شاہ جی ان قاری کی نقل کر رہے تھے کہ ان کی نگاہ میں آگئے، وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جی کو فنِ قراءت سکھانے کے لئے اپنے تلمذ میں لے لیا۔ نتیجتہً شاہ جی اس باب میں یکتا ہو گئے، قاری محمد عمر عاصم کچھ عرصہ بعد کویت لوٹ گئے، ایک زمانہ میں امرتسر کے مولوی عبداللہ ڈار کویت گئے تو قاری صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ قاری صاحب نے ان سے پوچھا ایک نوجوان سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھ سے پڑھا

کرتا تھا اس سے واقف ہو؟ مولوی صاحب نے بتایا کہ وہ اب ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ پورا ہندوستان ان کا شیدائی ہے۔ قاری بہت خوش ہوئے۔

شاہ جی فرماتے تھے کہ نانی مرحومہ سے اُردو بول چال میں صحت پیدا کی شاد عظیم آبادی کی ادبی شہرت کا آغاز تھا وہ زبان و محاورہ کی سند و تحقیق کے لئے اکثر نانی اماں سے مشورہ کرتے اور مستفیض ہوتے تھے۔ ہم (شاہ جی) شاد کی صحبتوں میں رہ کر زبان و بیان میں اتارو ہو گئے اور ذہانت و ذکاوت کے فطری انعام نے طبیعت میں چار چاند لگا دیئے۔

پنجاب میں آمد

پنجاب آنے کی ایک روایت اوپر نقل ہو چکی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ شاہ جی، والد کی اجازت کے بغیر پٹنہ سے روانہ ہو کر امرتسر پہنچے اور وہاں اپنے ایک قرابت دار سید اسد اللہ شاہ بخاری کے ہاں چلے گئے، ان سے کہا کہ میں سید ضیاء الدین شاہ کا بیٹا ہوں اور ان کی اجازت کے بغیر آیا ہوں، شاہ جی فرماتے تھے کہ اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال ہو گی، اس لمبے سفر میں صعوبتیں سہیں مثلاً بنارس میں چلنے والی مسجد سے متصل میاں شاکر اللہ کے ہاں چاندی کے ورق کوٹ کر روزی پیدا کی، میاں صاحب کو کشتی لڑنے لڑانے کا شوق تھا ان سے ڈنڈ پیلنا سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی۔ امرتسر آکر یہ شوق تو ختم ہو گیا لیکن بدن کسرتی تھا ورزش کرتا رہا جسم و جان تندرست رہے۔ فرماتے اوائل عمر میں مجھے پتنگیں لڑانے اور کبوتر اڑانے کا بھی بہت شوق تھا لیکن ابا جان سے چوری چھپے۔ ابا ادھر اُدھر ہوتے تو ماموں جان سے مل کر کوٹھے پر پتنگیں لڑاتا۔ بسا اوقات پیچ اس لئے کٹ جاتے کہ ابا جان دکھائی پڑتے اور ہم جھٹ سے نیچے آکر گھر میں حفظ کرنے لگتے جب تک ان کا چہرہ متبسم نہ ہو خوف ہی رہتا، مبادا دیکھ لیا ہو اور پٹائی ہو۔

شاہ جی آخر عمر میں بالخصوص جب ہندوستان بٹ رہا تھا ان گئے دنوں کو یاد کرتے اور عمر رفتہ کے تذکرہ سے خوش ہوتے تھے۔ ان کے تحت الشعور میں پنجابی ہونے سے کہیں اپنے

بہاری ہونے کا احساس تھا۔ وہ نانی اماں کی زبان دانی سے فیض پانے پر فخر کرتے اور شاد عظیم آبادی سے اپنی ہم صحبتی و ہم سخنی کے واقعات بڑے کر و فخر سے بیان کرتے جہاں تک اُردو زبان سے آشنائی کا تعلق تھا وہ کسی بھی اہل زبان سے اپنے تئیں کم نہ سمجھتے تھے اپنی زبان کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ع

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اور یہ غلط نہ تھا۔

احساس شرف

شاہ جی میں گدی نشینوں کی سی انسان آزاری بالکل نہ تھی البتہ ان میں اپنے سید ہونے پر جائز فخر تھا اور اکثر اس فخر و شرف کا تذکرہ کرتے۔

ایک دن دہلی دروازہ کے باغ میں مسرح صحابہ پر تقریر کر رہے تھے کسی نے اعتراض کیا۔

شاہ جی! غضب کرتے ہو سید ہو کے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کی مدح!

پس تاؤ میں آ گئے اپنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"تم کون ہو مجھے ٹوکنے والے، جاؤ میں علیؓ کا بیٹا، ابوبکر و عمر و عثمان رضوان اللہ و تعالیٰ اجمعین کی مدح کرتا ہوں۔ یہ علیؓ کا بیٹا ہی جانتا ہے کہ ان کا رتبہ کیا ہے۔ ایرے غیرے پچ کلیان کیا جانیں کہ شیخینؓ کا مقام کیا ہے؟

فرماتے:

مسلمانوں کے معاملات شروع ہی سے بگڑے ہوئے ہیں وہ قال الرسول پہ ایمان لاکر بھی آل رسول کو ذبح کرتے رہے ہیں۔ سید ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی ناکامیوں پر ذرہ برابر ملال نہیں، ہمارے ساتھ یہی ہوتا رہا اور یہی ہوتا رہے گا۔ مسلمانوں نے جن لوگوں کی دین میں راہنمائی قبول کی انہیں دنیا میں ہمیشہ ستایا ہے۔

سیاست میں شرکت

شاہ جی امرتسر میں علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ پہلی جنگِ عظیم خلافتِ عثمانیہ کو تاراج کر کے ختم ہو گئی۔ ہندوستان کو جو صلہ ملا وہ سب کے سامنے تھا۔ رولٹ ایکٹ نے سارے ملک کو برہم کر دیا، پنجاب کو جو اس جنگ میں برطانوی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن تھا یہ انعام ملا کہ کئی اضلاع میں مارشل لاء یا اس سے مشابہ قانون نافذ کئے گئے۔ گرفتاریوں کا زور بندھ گیا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا جس سے ملک کی تاریخ پلٹا کھا گئی اور سیاسی لیڈرشپ پہلے ہاتھوں سے نکل کے نئے ہاتھوں میں آگئی، یہی وہ آغاز تھا کہ ملک اور گھوکھلے پیچھے ہٹ گئے مسٹر جینا ابھی نوجوان تھے اور گاندھی جی کی طرح گھوکھلے کے سیاسی شاگرد تھے لیکن وہ بھی مسلمانوں کی سرکاری لیڈرشپ کے مانند گوشہ نشین ہو گئے۔ یہ زمانہ مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو اور علی برادران کا سرآغاز تھا اور ملک اس نئی لیڈرشپ کے ہاتھ میں جا رہا تھا۔

جلیانوالہ باغ کے مظالم سے ملک بھر میں آگ لگ گئی۔ امرتسر میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ یہ ہندوستان کے سفرِ آزادی کا پہلا موڑ تھا۔ اس زمانہ کے بعض انگریز افسروں نے اعتراف کیا ہے کہ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کی آتش بازی ہندوستان سے انگریزی حکومت کی رخصتی کا سرآغاز تھا۔ پاکستان کے مشہور مصنف ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ ۱۹۶۸ء میں وہ ڈھونڈھ ڈھانڈ کے انگلستان کے ایک گاؤں میں امرتسر کے اس ڈپٹی کمشنر سے ملنے گئے جس نے جلیانوالہ باغ میں فائرنگ کا حکم دیا تھا۔ اس بوڑھے انسان نے ان دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ہم نے امرتسر پر قابو ضرور پا لیا تھا لیکن وہ دن برطانوی حکومت کے انخلاء کا پہلا دن تھا۔

شاہ جی ان دنوں مدرسہ نعمانیہ مسجد خیر الدین میں مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے لیکن طالب علمی ادھوری تھی، ایک چھوٹی سی مسجد (کوچہ جیل خانہ) میں امام ہو گئے چونکہ خوش الحان

وخوش بیان تھے لہٰذا امرتسر کے مسلمانوں میں واعظ کرنے لگے، ان دنوں بدعات کا زور تھا، اصلاح رسوم کی نیو اُٹھائی اور تمام شہر میں ایک خوش بیان و فصیح اللسان کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمۃ نے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ:

"میں نے امرتسر میں خلافت کمیٹی (۱۹۱۹ء) کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو انگریزوں کے مظالم سے آگاہ کرنا شروع کیا تو بعض لوگوں نے میرے خلاف شاہ جی کو کھڑا کیا۔ میں نے اندازہ کیا کہ شاہ جی کو ملکی حالات اور قومی سیاست کا مطلقاً علم نہیں، وہ استعمال کئے گئے ہیں، میں نے شاہ جی کو اپنے ہاں بلا بھیجا، ان سے بات چیت کی معلوم ہوا وہ نہ تو اخبارات پڑھتے ہیں نہ سیاست سے آشنا ہیں اور نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ خلافت وغیرہ کا مسئلہ کیا ہے؟ آخر میری تحریک پر راضی ہو گئے کہ وہ میرے ساتھ رہ کر چند دنوں میں ان مسائل سے آگاہ ہو جائیں گے چنانچہ ایک مختصر سی مدت ہی میں وہ سب کچھ جان گئے پھر دنیا جانتی ہے کہ اس عظیم الشان خطیب نے سارے ملک میں آگ لگا دی"۔

شاہ جی فرماتے تھے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال نے ان کی کایا پلٹ دی اور مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار و ستارۂ صبح نے انہیں حریت پسندوں کے قافلہ میں شامل کر دیا۔ یہاں لاہور کے ایک جلسۂ عام میں مولانا ظفر علی خاں کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا:

"ظفر علی خان ترے ستارۂ صبح نے میرے جگر میں آگ لگا دی تھی"۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک پنجاب کی سیاسی آبیاری اور ہندوستان کے قومی ذہن کی نشوونما میں جن راہنماؤں کا نام سرفہرست ہے ان سربرآوردہ راہنماؤں کی جماعت میں شاہ جی کی جادو بیانی کا بہت بڑا حصہ تھا۔ وہ اس وقت مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہ کی صف کے سیاسی راہنما نہ تھے۔ لیکن تحریک خلافت یا تحریک عدم تعاون کا تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی نے اس قومی جدوجہد کو بال و پر مہیا کئے اور دیکھتی آنکھوں ہندوستان کے ان نامور خطبا کی صف میں شامل ہو گئے جن کی

رجز خوانیوں سے یہ کارواں منزلِ مقصود کی طرف چلا جا رہا تھا۔

مہاتما گاندھی نے قومی سیاست میں داخل ہوتے ہی ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو رولٹ ایکٹ کے خلاف ہمہ گیر ہڑتال کا اعلان کیا تو ایک نیا ہندوستان پیدا ہو گیا۔ یہی وہ دن تھے جب ہندو مسلم اتحاد ایک معجزہ تھا۔ اور انگریز اس سے سخت ہراساں تھے۔ انہی دنوں امرتسر میں ریلوے کے بڑے پل سے ایک احتجاجی جلوس گزر رہا تھا کہ گورہ سپاہیوں نے گولی چلا دی جس سے چھ ہندوستانی جاں بحق ہو گئے، شاہ جی نے خیر الدین کی مسجد میں مسلمان شہداء کا جنازہ پڑھایا۔ ۱۰ اپریل کو ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال گرفتار کیے گئے تو سارا شہر آگ بگولا ہو گیا۔ ۱۳ اپریل کو یکم بیساکھ تھا امرتسر کے لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے جلیانوالہ باغ میں اکٹھے ہوئے لیکن جنرل ڈائر کی بے تحاشا گولیوں کا نشانہ بن گئے اس مقتل میں پانسو ہندوستانی شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بصدارت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی حکیم اجمل خان کے زیر صدارت یہیں ہوا اور خلافت کانفرنس بھی مولانا شوکت علی کے زیر صدارت گول باغ امرتسر میں منعقد ہوئی ——— شاہ جی نے اس کانفرنس میں معرکہ آرا سیاسی تقریر کی یہ اُن کے جماعتی سفر کا آغاز تھا۔ اجلاس میں تحریک خلافت کے لیے دس لاکھ روپے اکٹھے ہو گئے، شاہ جی امرتسر سے باہر پہلی دفعہ کلکتہ کانگرس (فروری ۱۹۲۱ء) کے سالانہ اجلاس میں شامل ہوئے اور وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز ترک موالات کی تائید میں ایک پُرشکوہ تقریر کی اس سے ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صفِ اوّل کے ہندوستانی راہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔

لاہور میں پہلی خلافت کمیٹی قائم کی گئی تو علامہ اقبالؒ اس کے صدر اور سر محمد شفیع سیکرٹری مقرر ہوئے لیکن سر مائیکل اڈوائر کے غضب کی تاب نہ لا کر ڈپٹی کمشنر لاہور کے اشارے پر مستعفی ہو گئے بلکہ خلافت کمیٹی ہی کو ختم کر دیا۔ حکیم عبدالمجید عتیقی مولانا ثناء اللہ کے ہاں

امرتسر پہنچے اور اُن سے یہ ماجرا بیان کیا۔ مولانا ثناء اللہ نے ان کے ساتھ شاہ جی کو لاہور بھیجا دیا، جلسۂ عام کا اعلان ہوا تو خوف کا یہ عالم تھا کہ موچی دروازہ کے باغ میں تین چار سو آدمی جمع نہ ہو سکے لیکن شاہ جی کی قرآن خوانی اور خوش بیانی رنگ لائی، اگلے روز جلسہ میں ۲۰ ہزار آدمی شریک ہوئے اور شاہ جی صبح تین بجے تک بولتے رہے۔ تمام سرکار مسحور ہو گئے۔ شاہ جی نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ لاہور میں خلافت کمیٹی ضرور بنے گی کسی حاطب اللیل میں ہمت ہے تو وہ اس کمیٹی کو توڑ کر دکھائے۔ چنانچہ شاہ محمد غوث سے متصل میاں سراج الدین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم کیا گیا اور وہیں عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کمیٹی کے صدر اور میاں فیروز الدین احمد سیکرٹری منتخب کیے گئے۔

سیاسی مسلک

یہ کہنا مشکل ہے کہ شاہ جی دیوبند کے مدرسہ فکر سے ذہناً کب وابستہ ہوئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے ان کی نظری وابستگی کا سن آغاز کیا تھا لیکن دیوبندی نہ ہونے کے باوجود ان کا دیوبند کے اکابر و افکار سے رشتہ اس قدر گہرا ہو گیا کہ ان کے مبلغ بھی تھے اور مجاہد بھی۔ عمر بھر انہوں نے اس مدرسۂ فکر کا ساتھ دیا، کسی عنوان سے جب کوئی معرکہ دیوبند کے دفاع یا دعوت کا پیش آیا شاہ جی ہمیشہ اس کے ہراول میں رہے۔

شاہ جی نے بدعات سے جنگ کی تو دیوبند کی تعلیمات کو ملحوظ رکھا۔ سلطان ابن سعود کا ساتھ دیا تو دیوبند ہی کا مطمح نظر سامنے رکھا۔ انگریزوں سے ان کے جہاد و غزا کا سبب بھی دیوبند ہی کے اکابر کا فکر و عمل تھا۔ وہ انگریزوں کے اس لئے مخالف نہیں تھے کہ ان کے پیش نظر محض نظریاتی مبہم کا اصل اصول تھا ان کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا سبب یہ بھی تھا کہ برعظیم کے علماء نے نصاریٰ کی ہر نوعی غلامی کو حرام قرار دیا اور ہندوستان ان کے نزدیک "دار الحرب" ہو گیا تھا، برطانیہ کو وہ اسلام کا دشمن سمجھتے اور اس کے خلاف جہاد و جنگ فی الجملہ ان کا نصب العین تھا۔

وہ دراصل شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ

کی جدوجہد کے سیاسی ورثاء میں سے تھے۔ ان کی تمام جدوجہد کا ماحصل یہ تھا کہ جو کچھ ان اکابر کے منہ سے نکلا اس کی آبیاری و ثمر آوری اپنا دینی فرض سمجھا۔ انہیں ہندوستان کے سیاسی مباحث یا قومی مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا وہ صرف اکابر علماء کی سیاسی روایتوں اور دینی حکایتوں کے معنوی وارث تھے اور ان کے مطابق اپنی جدوجہد کا سفر کرتے رہے۔ ان کے سامنے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ فتویٰ (۱۷۶۵ء) تھا کہ:

"انگریزی حکومت سے جہاد فرض ہو چکا ہے اس کی توفیق نہ ہو تو ہر دیندار مسلمان پر ہجرت لازم ہو گئی ہے" (بہ تلخیص)

مولانا عبدالباری (فرنگی محل لکھنؤ) نے اپریل ۱۹۱۵ء کو اس فتویٰ ہی کی اساس پر فتویٰ دیا تھا کہ:

"ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں کی قدریں اسلام سے ملحق ہوں"

اسی کا نتیجہ ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کی ہجرت تھی۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس دہلی کے اجلاس میں علامہ عزیز ہندی نے اس مضمون کی قرارداد پیش کی تو فوراً پاس ہو گئی، لوگوں نے ہجرت شروع کی اور لوگ قافلہ در قافلہ کابل جانے لگے حکومت نے ابتداً روکنا چاہا لیکن مانتا کون؟ آناً فاناً کوئی چالیس ہزار افراد افغانستان پہنچ گئے۔ غازی امان اللہ نے انہیں زمینیں دیں، ملازمتیں دیں اور تجارت میں حصہ دار کیا لیکن جو لوگ سرکاری جاسوس کی حیثیت سے ان کے ساتھ گئے تھے وہ گل کھلانے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے امان اللہ خان کو بھی زچ کیا تاہم ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ افغانستان انگریزی حکومت کے انتداب سے آزاد ہو گیا۔ ہجرت کرنے والوں میں مولانا احمد علی لاہوری، خان عبدالغفار خان اور جناب اقبال شیدائی بھی شامل تھے۔

مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ ان دنوں لندن میں وفد خلافت

لے کر گئے ہوئے تھے، یہاں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ اس ہجرت کو مضر خیال کرتے اور ہندوستان ہی میں غیر ملکی غلامی کے خلاف نبرد آزمائی کے حق میں تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۱ جولائی ۱۹۲۰ء کو خلافت کانفرنس کراچی کے اجلاس میں حکومت برطانیہ کی ہر نوعی ملازمت کو شرعاً حرام قرار دیا تو اس قرارداد اور مختلف زعماء کی تقریروں سے برافروختہ ہو کر حکومت نے ملک بھر میں گرفتاریوں کا آغاز کیا۔ مولانا محمد علی، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد وغیرہم کراچی میں ۱۲۴ الف کے تحت دھر لئے گئے، انہیں دو دو اور تین تین برس کی سزا دی گئی۔

آخر کار منفی و مثبت اثرات کے تحت ہجرت کی تحریک ختم ہو گئی، کچھ لوگوں کے سوا تقریباً سبھی لوگ واپس آ گئے، اُن مسلمانوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا جو اپنی جائدادیں اونے پونے فروخت کر کے کابل گئے تھے، لاہور سے دو مولوی عبدالحق اور عبدالرحمٰن بھی سرکاری جاسوس کی حیثیت سے مہاجروں کے ساتھ گئے تھے لیکن اُن کا انجام یہ ہوا کہ دونو حکومت کے ہاتھوں مارے گئے۔

شاہ جی تحریک ہجرت کے معاون تھے اور انہی کی تقریروں سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ امرتسر سے کابل گئے تھے۔

اُدھر حضرت شیخ الہند محمود حسن (علیہ الرحمۃ) اپنے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچے تو جمعیۃ العلماء نے شیخ الہند کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس زمانہ ہی میں شیخ الہند کے ہاتھوں جامعہ ملیہ دہلی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر جامعہ کے بانی تھے اور انہی کی تحریک پر جامعہ قائم ہوا تھا۔ اِدھر شاہ جی نے انہی دنوں گجرات میں آزاد ہائی سکول قائم کیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے افتتاح کیا۔ چودھری فیض محمد ایم، اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خان عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر کئے گئے۔ آجکل وہ اسلامیہ ہائی سکول کے نام سے منسوب ہے۔ آخر کار حکومت نے ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو آدھی رات کے وقت

زیر دفعہ ۱۲۴ الف شاہ جی کو پکڑ لیا۔ کچھ دنوں مقدمہ چلا پھر ۸ اپریل کو مسٹر ایف اے کارنز ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تین سال قید بامشقت کی سزا سنادی، اس میں تین ماہ قید تنہائی کے تھے ـــــ اس قید نے شاہ جی کو انگریزی حکومت کا مستقل باغی بنا دیا اور وہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کے بارہ بجے تک برطانوی استعمار کے خلاف جد و جہد کرتے رہے، ان ۲۶ سال میں انہوں نے آٹھ سے دس ہزار کے درمیان تقریریں کی ہوں گی جن کا لب و لباب اور مطلع و مقطع انگریزی حکومت کی بیخکنی تھا۔

شاہ جی نے اس سارے عرصہ میں بہت سے معرکے سر کیے اور کئی دفعہ جیل گئے مثلاً تحریک خلافت، تحریک شدھی، تحریک قبہ، تحریک حفظ ناموس رسالتؐ، تحریک میرزائیت تحریک عدم تعاون، تحریک کشمیر، تحریک شہید گنج، تحریک آزادیٔ وطن اور دوسری جنگِ عظیم میں فوجی بھرتی کی مزاحمت! فی الجملہ قومی جد و جہد، سیاسی رزم و بزم اور دینی جہاد و جنگ کے مختلف العنوان سلسلے تھے جن میں شاہ جی نے بھرپور حصہ لیا۔ وہ محض حصہ دار ہی نہیں تھے بلکہ ان کا پورا کردار ایک ایسے حدی خوان کا تھا جس کی آواز سے قافلہ مرتب ہوتا اور منزل کی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ یہ ذکر کسی دوسرے باب میں آئے گا کہ اس سفر میں وہ کن کن صعوبتوں سے گزرے اور اپنی عمر عزیز کا کتنا حصہ قید و بند کے آغوش میں بسر کیا حتیٰ کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

عقیدہ و مسلک

شاہ جی حنفی مسلک کے تھے لیکن ان حدود کے باوجود قلندر قسم کے مسلمان تھے کہ ہر مسلک و مشرب سے ایک گونہ مناسبت تھی، کسی مسلک سے تعرض ہوتا تو اس کے پس منظر میں صرف یہ چیز ہوتی کہ اس کی بنیاد میں انگریز دوستی تو نہیں ہے یا پھر وہ ان مظاہر و آثار کے مخالف تھے جن سے شرک فی التوحید یا شرک فی النبوۃ کو راستہ ملتا تھا اور لوگ اصل دین کو چھوڑ کر نقلی دین کا کھڑاگ رچاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ از روئے اسلام وہ ہر اُس مسلک و مشرب کے ساتھ تھے جس سے انگریزوں کی غلامی ختم ہوتی اور ان کے خلاف ذہنی آب و ہوا کو نشو و بلوغ حاصل ہوتا اور ہر اس مسلک و مشرب سے کنی کتراتے بلکہ اس کے پیروؤں پر بشرط ضرورت تابڑ توڑ حملے کرتے جس مسلک و مشرب کو مداہنت و مصلحت سے داغدار پاتے۔

انہوں نے شہادتِ حسینؓ پر بہت کم تقریریں کیں، ایک دفعہ راقم نے عرض کیا کہ شاہ جی سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے، کہنے لگے میں اس موضوع پر تقریر نہیں کر سکتا میرے خاندان پر جو بیتی ہے بیان کروں تو خود میرا جگر شق ہو جائے گا لیکن عام تقریروں میں جب کبھی اس حادثہ محزنہ کا ذکر کرتے تو ایک آدھ روایت ہی سے لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں کہ بڑے بڑے ذاکر و مجتہد ان کے سامنے رہ جاتے تھے۔ ان کا مسلک سینہ کوبی یا سوز خوانی نہیں تھا۔ جب کبھی کسی سیاسی مسئلہ میں شیعہ اکابر کو جھنجھوڑتے تو فرماتے:

"کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟ حسین علیہ السلام کا نام لیتے ہو لیکن صدیوں سے تمہارا شعار یہ ہو گیا ہے کہ یزید مُردہ پر لعن کرتے ہو اور یزید زندہ کی پوجا کرتے ہو"؟

بدعات کے خلاف طعن و تعریض کرتے اور مسلمانوں کو ان سے روکتے تو دو کا ندار علماء ان پر وہابی کا طعن توڑتے لیکن ان کے لئے یہ طعن بیکار تھا۔ جن دنوں ابنِ سعود نے قبہ شکنی کی اور سرکاری علماء نے ہندوستان میں ابنِ سعود کے خلاف ہنگامہ برپا کیا تو شاہ جی ابنِ سعود کے طرفدار تھے اس جرم میں انہیں وہابی کہا گیا حالانکہ وہابی نہ تھے اور نہ کبھی جماعتِ اہل حدیث نے اپنی کسی تحریر و تاریخ میں انہیں اپنا تسلیم کیا لیکن ہندوستان کے اہل حدیث علماء کی سزا اکثر انہیں ملی، جگہ جگہ شاہ جی کے وہابی ہونے کا چرچا ہو گیا۔ ان دنوں کسی بدو نے سلطان عبد العزیز ابن سعود کو بیت اللہ میں خنجر مار کر ہلاک کرنا چاہا، محافظ دستہ آڑے آگیا اور سلطان محفوظ ہو گئے لیکن حملہ آور محافظ کی گولی سے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شاہ جی ابن سعود ہی کے مسئلہ پر تقریر کر رہے تھے سوال کیا گیا،

شاہ جی! حرم میں گولی چلانا جائز ہے؟

فرمایا، نہیں بھائی خنجر چلانا جائز ہے۔

اور لوگ داد و تحسین میں ڈوب گئے۔

غرض شاہ جی ہنستے ہنساتے بہت سی باتیں کہہ جاتے، کسی نے کہا:

شاہ جی وہابی اور غیر وہابی میں کیا فرق ہے؟

فرمایا اس قسم کے سوال نہ کیا کرو، دین کی توقیر کم ہوتی ہے، سائل کا اصرار بڑھا تو کہنے لگے،

میاں! جو تم کہلوانا چاہتے ہو وہ یہ ہے کہ وہابی بے ادب باایمان ہوتا ہے اور غیر وہابی

باادب بے ایمان۔

ظاہر ہے کہ یہ مذاق تھا جو لوگ اس قسم کے شرارتی سوال کرتے ان کے لئے ایسے ہی

جواب شافی ہوتے تھے۔

ایک روز شاہ جی علامہ انور صابری سے قوالی سن رہے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن آگئے،

لاحول پڑھا، شاہ جی نے اِنّا للہ فرمایا، بھائی حبیب الرحمٰن! مذہب کسی بیوست کا نام

نہیں، میں چشتی بھی ہوں، نقشبندی بھی اور قادری بھی، مجھے ان تمام مسالک سے باطنی

ربط ہے۔

شاہ جی روایتی طور پر صوفی بالکل نہیں تھے لیکن زندگی سنوارنے کے لئے شیخ کی صحبت

ضروری سمجھتے، ان کے نزدیک تصوف، مسکینی و عاجزی یا گوشہ نشینی و دستبرداری کا نام نہیں

تھا۔ وہ تصوف کو احسان سے تعبیر کرتے اور احسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے

مطابق ایک ایسی عبادت ہے گویا خدا تم کو دیکھ رہا ہے یا تمہارا یہ سمجھنا کہ خدا تمہیں دیکھ

رہا ہے، شاہ جی عموماً کہا کرتے کہ نظر کا فیضان کتابوں سے نہیں بزرگوں کی صحبت اور

توجہ سے پیدا ہوتا ہے اور یہی اصل تصوف ہے، جن چیزوں کو معروفات سمجھتے ان کے

نزدیک وہ علم الیقین اور عین الیقین ہی نہیں بلکہ حق الیقین کا درجہ رکھتی تھیں، فرماتے

تصوف، وجدان کی تنقیح کرتا ہے اور علم سے وسعت فکر پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں امام مالک کے نقطہ نگاہ سے موافق تھے کہ جو شخص صوفی ہوا اور فقیہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا، اور جو فقیہ ہوا اور صوفی نہ ہوا وہ فاسق رہا جس نے ان دونو کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا۔ وہ ہندوستان کے صوفیوں کی بہت سی ٹکڑیوں سے بیزار تھے ان کا خیال ہی نہیں، تجربہ تھا کہ ہندوستان کا تصوف ہندومائی تھالوجی (خرافیات) کی اسلامی شکل ہے اس کو حجازی اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، جس تصوف سے سکینت پیدا ہو یا توجہ الی اللہ مخلوق خدا سے کنارہ کشی سکھائے وہ اس مسلک سے بیزار تھے ان کے نزدیک یہ ہندوازم کا جوگ تھا۔

خلاف تعلیم رسول اللہ ﷺ

فرمایا ایک دفعہ میں نے بھی خانقاہی ہونا چاہا، ۲۱ سال تک روزے رکھے چھ چھ گھنٹے میں قرآن پاک ختم کیا، کئی کئی روز پانی میں نمک ملا کر جو کے ستوؤں پر گزر کی، تنور کی روٹی کے خستہ ٹکڑے کھاتا رہا لیکن اس سے بس اتنی معرفت قلب پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں قناعت پیدا کر دی اور میں سیر چشم ہو گیا اس ریاضت ہی کا نتیجہ میری خطابت کا بانکپن تھا۔

قبہ شکنی کا ذکر ہو رہا تھا فرمانے لگے میں نے ابن سعود کی حمایت صرف اس لئے کی تھی کہ جو لوگ یہاں ان کی مخالفت میں پیش پیش ہیں وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مہرے تھے اور ابن سعود کا وجود برطانوی حکومت کے لئے اس لحاظ سے سوہان روح تھا کہ اس نے انگریزی استعمار کے ایک ذلیل مہرے شریف مکہ کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ شاہ جی کا ارشاد تھا کہ ہندوستان میں وہی لوگ ابن سعود کے خلاف واویلا کر رہے تھے جو پہلی جنگِ عظیم میں انگریزوں کے خدمتگار اور سپاس گزار تھے۔ (الا ماشاء اللہ) ان کے نزدیک ابن سعود کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کا ہنگامہ انگریزوں کی شاطری تھا۔ انگریزوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ تحریکِ خلافت ان کے لئے کیا داغ چھوڑ گئی ہے اور مسلمانوں کی دنیائے اسلام سے وابستگی کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو شریف مکہ سے جو نفرت پیدا ہوئی تھی انگریز اپنے اس مہرے کی شکست کے بعد اس نفرت کو ابن سعود کی طرف منتقل کرنا چاہتے تھے تاکہ حجاز میں انگریزوں کی آئندہ

سیاست ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کسی نئی تحریک کا باعث نہ ہو۔

شاہ جی نے اس مہم میں ضعیف الخیال مسلمانوں سے بہت سی گالیاں سُنیں لیکن اپنا مشن جاری رکھا۔ اور کفر کے فتوؤں کو خندۂ زیر لب کی نذر کرتے رہے، جیسے کوئی چیز ہی نہیں۔

شاہ جی اصلح من الناس کے قائل تھے، حضرت سیّد پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف سے بیعت ارشاد کی، حضرت شیخ عبدالقادرؒ رائے پوری سے بیعت جہاد، وہ خواجہ معین الدّینؒ چشتی، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے والہ وشیدا تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے شیدائی اور شاہ ولی اللہؒ کے فدائی تھے۔ حقیقتہً وہ ایک سیدھے سادے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کے ہاں مذہب کی رعونت اور دین کا آزار بالکل نہ تھا، غرض فقر و سیاست کا ایک ایسا چشمہ تھے جس سے کئی سوتے پھوٹتے تھے۔ وہ اہل اللہ کے سوا کسی سے مرعوب نہ ہوتے، قدرت سے بے نیاز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے اور آخری سانس تک اس پر قائم رہے کوئی شخص اپنے اقتدار و وجاہت کے بل پر ان سے کوئی مطالبہ نہ کر سکتا تھا۔

ان کی محفل آرائیاں سیکڑوں مرتب و غیر مرتب کتابوں کا خلاصہ ہوتیں، ان کے ہاں کسی کیلئے کوئی روک نہ تھی وہ انگریزی استعمار اور میرزا غلام احمد کی نبوت کے سوا کسی کے دشمن نہ تھے ان کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا تھا۔ جہاں ایک جام بدست رند سے لے کر ایک عمامہ بر سر زاہد تک اور ایک کفن بدوش مجاہد سے لے کر ایک شاہد بکنار شاعر تک بلا تکلف داخل ہو سکتے تھے وہ تنہائی سے نفرت کرتے اور آشنائی سے محبت رکھتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ تنہائی کے آگے بازار ہے اور بازار پریشانی کا نام ہے لیکن وہ کانٹوں میں کھلنے والے انسان تھے، انہیں تخلیہ سے زیادہ مجمع اور کتابوں سے زیادہ انسانوں کا غول پسند تھا، فرماتے ان کتابوں کو پڑھ کر کیا لوں گا؟ جن سے عقل حیران ہوتی اور عشق کو مصلحت کی دیمک لگ جاتی ہے، اپنے احباب میں اکثر و بیشتر ذیل کا شعر بہ لحن پڑھا کرتے ؎

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نہ شود
ز زہد ہمچو توئے یا ز فسق ہمچو منے

اٹکاؤ اور لگاؤ

ان کی سب سے بڑی کمزوری (Weekness) حسن تھا، حسن کے معاملے میں "دل پھینک" واقع ہوئے تھے یہاں ان کا مسلک بو علی قلندر کا مسلک تھا حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، پہاڑوں پہ ہو یا میدانوں میں غرضیکہ فطری حسن سے والہانہ لگاؤ تھا ان ہی کا شعر ہے ؎

باغ و بہار ماندیم یعنی کہ جنت النعیم
روئے خوش است خوئے خوش بوئے خوش و گلۂ خوش

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم و مغفور آزادی ہندوستان کی جدوجہد میں ان کے رفیق تھے، ان سے جو خصوصیت رہی واقفان حال سے پوشیدہ نہیں، اکثر کہا کرتے "میں ملتجھے شاہ ہوں اور حبیب الرحمٰن عنایت ارائیں" —— لیکن پیر و مرید دونو ایک دوسرے کی ضد تھے، وہ جلالی یہ جمالی۔ جلالی نے جمالی کو ٹوکا شاہ صاحب۔ کیا بزم جما رکھی ہے؟ فضول، بے معنی، لغو۔ مگر شاہ جی فضول، بے معنی، لغو پر ریجھ چکے تھے اب انہیں لاکھ کہیئے، قبلہ! جلسہ گاہ میں ہزاروں لوگ امیر شریعت کی راہ دیکھ رہے ہیں لیکن امیر شریعت گرد و پیش کے حسن پر نقد و نظر فرما رہے ہیں اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ان کے نقد و نظر کی زبان غالب سے لے کر نظیری تک اور میر سے لے کر عرفی تک سے مستعار ہوتی۔ ان مواقع پر خود آواز بن جاتے، طبیعت موج زن ہوتی۔ عربی شعراء کا بھرپور کلام سنانے لگتے، کسی مصرع کی شرح کر دی، کسی مصرع پر چپ سادھ لی۔ بسا اوقات اچھے چہروں سے موضوع ڈھونڈ لیتے اور قرآن و حدیث سے استنباط کرتے ؎

الشمسوا الخیر فی حسان الوجوہ (الحدیث)

اچھے چہروں میں بھلائی کی جستجو کرو۔

اس ضمن میں ان کی معلومات حد درجہ وسیع تھیں، آخری عمر میں آواز کا رسیلا پن کسی قدر بہہ گیا تھا لیکن ٹھک اور کھٹک موت کے بستر پر دراز ہونے تک رہی۔ عمدہ عطر اور اچھی آواز پر جی جان سے مرتے تھے۔ کوئی خوش الحان قاری ملتا تو پہروں قرآن سنتے اور مغنی ہوتا تو شعر و شاعری میں جہاں تک بس چلے ڈوب جاتے۔

شاعری کا شوق

خطیب معناً شاعر ہوتا ہے انہیں شعر گوئی کا ملکہ بھی تھا۔ ندیم تخلص فرماتے، ان کا مجموعہ کلام "سوانح الالہام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کے مطابق شعر گوئی کا ذوق شروع میں نانا مرحوم اور شاد عظیم آبادی کی صحبتوں سے پیدا ہوا لیکن امرتسر میں مولانا محمد دین غریب سے تلمذ اختیار کیا مگر جلد ہی پنڈ چھوڑ دیا۔ تحریکِ خلافت میں قید ہوئے تو میانوالی جیل میں ملکہ شعر جاگ اٹھا۔ مولانا عبدالمجید سالک بھی ساتھ ہی قید میں تھے ان سے مشورۂ سخن شروع کیا پھر حضرت طالوت سے استفادہ فرماتے رہے۔ کوئی باقاعدہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری باقاعدہ تھی۔ بس جذبات کا ایک ابال تھا۔ اس مجموعہ میں دو چار نعتیں ایسی ضرور ہیں جن میں شعری بانکپن جھلکتا ہے، طبیعت کی موزونی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ساحر لدھیانوی نے قحط بنگال پر جو نظم لکھی ہے اس کے ایک بند کا دوسرا شعر نہیں ہو رہا تھا، شاہ جی نے نظم پڑھی، تعریف کی، ساحر سے کہا:

"اس کا صلہ یہ چند آنسو ہیں انہیں فقیر کا نذرانہ سمجھو"

شاعر نے تشکر و امتنان میں سر جھکا لیا، شاہ جی نے پوچھا اس بند کا دوسرا شعر کہاں ہے، وہ شعر تھا ؎

رلیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

ساحر نے کہا ابھی تک کوئی مناسب شعر موزوں نہیں ہو سکا، شاہ جی نے قدرے توقف کیا پھر فرمایا یہ لو حاضر ہے سے

چمن کو اس لئے مالی نے خون سے سینچا تھا
کہ اُس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

اور ساحر نے قبول کر لیا، ان کے مجموعہ کلام "تلخیاں" میں شامل ہے۔

مطالعہ

شاہ جی اصطلاحاً "کتابی" نہ تھے، ابتدائی مطالعہ ہی سے سیر تھے ان کے غور و فکر کا اصل محور قرآن مجید تھا جب کبھی تنہا ہوتے پڑھتے، سوچتے اور سر دھنتے، کوئی اچھی کتاب بالخصوص دینیات یا اسلامیات پر مل جاتی تو بڑے انہماک سے پڑھتے۔ تاریخ سے ایک گونہ دلچسپی تھی لیکن سیاسی تاریخ سے خصوصی بغض تھا، کلام ہر شاعر کا دیکھتے اور اس کی داد بھی دیتے، کوئی باقاعدہ لائبریری نہ تھی۔ امرتسر میں بعض نادر کتابیں اسلامیات پر جمع کی تھیں جن میں "الہلال" کے فائل وغیرہ بھی تھے مگر امرتسر لٹا تو وہ بھی غارت ہو گئیں۔ مرزائیت کے لٹریچر کو اپنی تبلیغی مہم کے لئے انتقادی نقطہ نگاہ سے دیکھتے اور پرکھتے، اخبار مستقلاً پڑھتے۔ بعض اخبارات کو ہاتھ تک نہ لگاتے کیونکہ ان پرچوں کی بجائے ان کے پرچہ نویسوں کو پڑھ چکے تھے، جدید لٹریچر سے انہیں کوئی واسطہ نہ رہا۔ بالخصوص کہانی، ناول اور افسانہ سے کوئی ربط نہ تھا۔ جدید شاعری میں نظم آزاد اور نظم معریٰ کو نہ صرف مضحک خیال کرتے بلکہ بعض معریٰ ابیات کی پیروڈی کی۔ جس کتاب کو اپنے نقطہ نگاہ سے مفید سمجھا اس کے لئے اشتہار بن گئے۔ ایک زمانہ میں سید محمد طفیل منگلوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کا مطالعہ ہر سیاسی کارکن پر فرض کر دیا، مدتوں علامہ اقبالؒ کا کلام ساتھ رکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتابی مطالعہ بہت تھوڑا اور

انسانی بہت زیادہ تھا، فرماتے، جس زمانہ میں پڑھتا تھا تو شب و روز پڑھتا تھا اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بہت سی کتابوں کے پڑھنے سے چند کام کی کتابیں پڑھ لینا بہتر ہے۔

تفریحات

کسی کھیل سے کوئی رغبت نہ تھی، تفریحات میں یکسر کورے تھے ان کی واحد تفریح محفل آرائیاں تھیں کبھی موج میں ہوتے تو گفتگو کے بہاؤ میں بعض باتیں کہہ جاتے، مثلاً بچپنے میں پتنگ بازی کا شوق تھا، اسی باعث گڈی کے کاغذ سے لے کر ڈور کی نسل تک سے باخبر تھے۔

ایک زمانہ میں کبوتر پالنے کا شوق تھا اور امرتسر میں کبوتروں کی ٹکڑی رکھتے تھے ہر کبوتر کا حسب نسب، رنگ روغن اور چال ڈھال جانتے تھے ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

فرماتے، گولے اور گرہ باز ان کبوتروں میں جواب نہیں رکھتے، گرہ باز کابل سے لائے گئے اور گولے عربی نسل سے ہیں لیکن ہندوستان میں ترکستان اور ایران سے درآمد کئے گئے تھے۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک وقت میں دو سو کی ٹکڑی بنا کر اڑ سکتے ہیں۔ گرہ باز دس بارہ کی ٹکڑی سے زائد میں نہیں اڑتے لیکن صبح سے شام تک اڑتے ہیں، اپنے آقا اور اڈے کو کبھی نہیں بھولتے، جن کبوتروں کی خوش رنگی اور خوبصورتی میں شہرت حاصل ہے ان میں شیرازی، گلی، نساوری، گلدسے، نلقے، لوٹن، چویا، چندن اور یا ہو، فقرا و مشائخ کو عزیز ہیں، یا ہو عموماً اہل اللہ کے مزاروں پر ہوتے ہیں۔

بٹیر بازی کو شرفا کا کھیل نہیں سمجھتے تھے مگر ان کی دو قسموں گھاگس اور چپنگ کو بٹالوی، نمک خواروں کے خلاف پھبتی کے طور پر استعمال کرتے رہے۔ ایک زمانے میں شطرنج کھیلنے کا شوق تھا جو رفتہ رفتہ محو ہو گیا۔ جوان تھے تو مگدر ہلاتے اور بنوٹ کھیلتے تھے۔ جیل خانے میں بیڈمنٹن سیکھی تھی، آخر ہر کھیل سے جی بھر گیا تو مرغ پالنے لگے، آٹے کی گولیاں بناتے اور مرغوں کو کھلاتے، اصیل مرغ کے بڑے قدردان تھے کہ عربی نسل سے ہے، میدان میں جم کر

لڑتا ہے، کوئی جانور اس سے بڑھ کر بہادر نہیں، مر جاتا ہے لیکن میدان سے منہ نہیں موڑتا۔

لباس و خوراک

تمام عمر موٹا جھوٹا پہنا۔ کھدر کبھی ترک نہیں کیا، پہلے شلوار کرتہ پہنتے اور سر پر رنگ دار تولیہ کی خود ساختہ ٹوپی اوڑھتے تھے پھر شلوار کی جگہ تہ بند نے لی اکثر خاکستری کرتہ یا قمیص جس کے اندر ترچھی جیبیں ہوتیں پہنتے تھے۔ ایک زمانہ میں سرخ قمیص پہننا شروع کی تو بعض شرعی گوشوں نے لب بستہ اعتراض کیا۔ فرمایا قصہ خوانی بازار (پشاور) کے شہیدوں کی یاد میں قمیص سرخ کی ہے احرار رضاکاروں کی وردی کا رنگ بھی انہی کے خون کی یاد میں سرخ تھا۔

خوراک عموماً سادہ کھاتے، محلوں اور جھونپڑوں میں مہمان ہوتے لیکن کسی چیز سے کوئی رغبت نہ تھی، دال بھات جو ملا کھا لیا۔ ایک وقت میں کئی کئی کھانوں کا سوال ہی نہ تھا بس ایک سالن روٹی یا چاول، میٹھا ملا کھا لیا نہ ملا شکر پھانک لی، خوراک زیادہ نہ کھاتے لیکن سیر ہو کر کھاتے اور دو وقت کھاتے، چائے گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، ہمیشہ نفیس چائے پیتے اور اکثر خود بنا کر پیتے، مدتوں کیتلی اور تمام چینی کا آب خورہ ساتھ رکھا، ان کے خیال میں ہر شخص چائے بنانے اور چائے پینے کا اہل نہ تھا، فرماتے عام لوگ چائے نہیں جوشاندہ پیتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح انہیں بھی چائے کی کہانی یاد تھی۔ طبیعت حاضر ہو تو مزے سے بیان کرتے، پان شروع سے کھاتے تھے، ایک چھوٹا سا پاندان ساتھ رکھتے، چھالیا خود کاٹتے، چونا خود بناتے اور کتھا بھی خود پکاتے تھے، اس پان خوری میں دانت گھلا دیئے تھے۔

عادات و خصائل

کبھی کسی دوست کی غیبت نہ کی اور نہ کسی دوست کی غیبت سنتے تھے۔ جو لوگ ان سے شدید اختلاف رکھتے مگر مخلص تھے ان کی جی جان سے عزت کرتے اور آنکھوں پر بٹھاتے۔ ذاتی دوستوں میں کئی ایسے تھے جن کی سیاسی راہیں مختلف تھیں۔ مثلاً تاثیر مرحوم لیکن ان سے ایک گونہ تعلق خاطر تھا۔ اسی طرح مولانا عبدالمجید سالک، سید احمد شاہ بخاری (پطرس) اور صوفی

غلام مصطفےٰ تبسم کا میدان فکر و نظر مختلف تھا لیکن ان سے سالہا سال کی دوستی تھی۔ ایک دفعہ جن کو پرکھ لیا، پرکھ لیا۔ پسند و ناپسند دونوں میں سخت تھے، ہر شخص سے متعلق نپی تلی رائے ہوتی، ہندوستان میں کوئی سیاسی یا شرعی راہنما ایسا نہ تھا جن سے ان کے مراسم نہ رہے ہوں لیکن ہر ایک کے بارے میں دوٹوک رائے رکھتے اگر کسی کے خلاف رائے قائم ہو گئی تو اس میں کینہ یا بغض نام کو نہ ہوتا اور نہ کسی سے ذاتی بنیادوں پر منتقم ہوتے۔ جن رفقا پر اعتماد کیا ان کی غلطیوں پر دامن ڈال دیتے جن دوستوں میں عمر بسر کی انہیں جی جان سے چاہا۔ ان سے کوئی شکایت پیدا ہوئی تو مسکرا کر ٹال گئے۔ بعض بڑی ہستیوں کے متعلق عجیب و غریب رائے تھی، گاندھی جی کو مہاتما کم اور سیاست دان زیادہ سمجھتے تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کو سچا نیشنلسٹ مالویہ جی اور ولبھ بھائی پٹیل کو پکا ہندو، مولانا ابوالکلام آزاد کو علم کا سمندر، پنڈت جواہر لال نہرو کو سیاسی طوفان، مولانا حسین احمد مدنی کو متحرک تقویٰ اور مفتی کفایت اللہ مرحوم کو دورِ حاضر کا ابوحنیفہ سمجھتے تھے علامہ اقبال سے تازیست دلی تعلق رہا۔ جب کبھی ان کے ہاں جاتے تو حضرت علامہ تپاک سے ملتے، فرماتے:

"پیر جی فلاں بات ہو گئی ہے۔"

"کونسی بات؟"

"بس ہو گئی ہے، آپ سے بیان کیا تو آپ دہلی دروازہ کے باغ میں ڈھنڈی پیٹ دو گے؛ اچھا سنئے، ایک تازہ نظم ہوئی ہے۔"

علامہ سناتے، شاہ جی سنتے اور جھومتے، چودھری افضل حق مرحوم کو احرار کے مہاتما کا لقب دے رکھا تھا۔

"کہو مہاتما جی، ہمارے لئے کیا پروگرام سوچ رکھا ہے؟"

مولانا حبیب الرحمٰن کو عنایت ارائیں کہتے اور خود بلھے شاہ بنتے۔ میاں قمر الدین مرحوم احرار کے بدلا تھے، انہیں اپنا چلتا پھرتا بنک کہہ کر پکارتے، شیخ حسام الدین سے

انتہائی اُنس تھا، مولانا مظہر علی کو یارِ جانی سمجھتے رہے۔ قاضی احسان احمد کو بیٹا۔ جماعت کے جن ساتھیوں سے انہیں لگاؤ تھا ان میں مولانا محمد علی جالندھری اور مولانا تاج محمود لائل پوری غایت درجہ قریب تھے۔ فی الجملہ احرار کا ایک ایک ساتھی اور ایک ایک رضاکار انہیں یکساں جذبات کے ساتھ عزیز تھا اور ان سب کو اپنی متاع سمجھتے تھے۔

ڈنڈے والا پیر

پنجاب کے دیہات میں "ڈنڈے والا پیر" کے نام سے مشہور تھے، احرار رضاکار کلہاڑی رکھنے لگے تو انہوں نے کلہاڑی اُٹھالی، کئی سال تلوار لئے پھرے، آخری عمر میں ڈنڈا رکھتے تھے۔

خط و کتابت

لکھنے لکھانے کا شوق کبھی نہ تھا۔ البتہ خطوط کا جواب سفر و حضر دونوں صورتوں میں خود لکھتے، غیر ضروری خط و کتابت سے اجتناب کرتے کسی کو تہنیت یا تعزیت کا خط نہیں لکھتے تھے، کوئی عزیز رحلت کر گیا تو گھر میں بیٹھ کر افسوس کر لیا کسی دوست کے ہاں خوشی ہوئی تو دُعا فرمادی۔

مجموعۂ صفات

زندگی بھر مسائل مختلفہ پر قرآن مجید کی آیتیں حضور سرورِ کائناتؐ کی حدیثیں اور ائمۂ کبار کے حالات اکھٹے کیے۔ ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ لطیفہ بازی اور برجستہ گوئی میں اتنے مشاق تھے کہ سارے برِ عظیم میں ان کی ٹکر کا ایک آدمی نہ تھا۔ ہر علاقہ کے عادات و اخلاق اور زبان و کلام سے اس تبحر کے ساتھ واقف تھے کہ انہیں پاکستانی زبانوں کا چلتا پھرتا لغت کہنا بے جا نہ تھا۔ سب سے بڑا کمال ان کی بے نیازی تھی، خوف غیر اللہ چمڑی میں نہ تھا۔ کسی کے روپے کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ذاتی مریدوں میں رنگا رنگ کے لوگ شامل تھے۔ بالخصوص ایسے لوگ جو قومی سیاست سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ بہت سے لوگ آپ کو پیروں بلکہ قبروں کی طرح پوجتے۔ پنجاب میں جتنے شخصی جاں نثار پیدا کیے اتنے کسی اور گروہ، جماعت

یا فرد کے گرد کبھی جمع نہیں ہوتے۔ اس باب میں منفرد تھے لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حکومت کی لیکن کسی شخص سے کوئی غرض نہ رکھی۔ ایک درویشانہ زندگی تھی، کسی مرید نے چھپا کر کچھ نذر گزارنا چاہا تو فوراً مٹھی کھول دیتے، جس جماعت میں رہے اس سے کبھی چھوٹی کوڑی تک نہ لی۔ اُلٹا اسی کے لئے روپیہ فراہم کیا۔ زندگی بھر جو کمایا اس سے امرتسر میں دو مکان خرید کئے۔ ایک میں خود رہتے، دوسرا کرایہ پر دے رکھا تھا، لیکن تقسیم کے وقت دونوں متروکہ ہو گئے۔ یہاں آکر کسی سرکاری دفتر سے کوئی آرزو نہیں کی حتیٰ کہ متروکہ جائیداد کے کلیم بھی داخل نہ کئے۔

عجیب و غریب

ان کے پاس ایک عجیب و غریب بٹوا تھا جس میں ایک مجذوب کی دی ہوئی پائیاں اور دھیلے پڑے تھے، فرماتے ان کی برکت سے ان کا بٹوا کبھی خالی نہیں رہا۔ ان معاملوں میں وہ خود بھی ایک مجذوب تھے۔

قاتلانہ حملے

قید و بند کی روداد تو علیحدہ باب میں آئے گی لیکن غیر ملکی غلامی کے خلاف جد و جہد کا سفر معمولی نہ تھا۔ قید و بند کے علاوہ بھی اس میں دو چار بہت سخت مقام آئے تھے، انگریزی حکومت نے تحریک خلافت کے تجربہ و مشاہدہ سے خوفزدہ ہو کر ہندو مسلم سناقشہ کی ایک ایسی نیو اُٹھائی کہ سرکار کے مسلمان زلہ رباؤں نے نہ صرف اس فتنہ کو مستقل کر دیا بلکہ ان تمام مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کی داغ بیل ڈالی جو ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو بنیاد سمجھتے اور انگریزی حکومت کے خلاف ہر نوعی جہاد میں شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے پروپیگنڈے سے اشتعال پیدا ہوتا اور لوگ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں اور زیادہ غصہ و غضب اپنوں ہی کے خلاف ہوتا ہے۔ ملک کے مختلف شہروں میں شاہ جی پر کئی دفعہ قاتلانہ حملے ہوئے اور وہ بفضلہ تعالیٰ ہر دفعہ بچ گئے، پہلا حملہ نمکین ستیہ گرہ کی تحریک

کے دنوں آگرہ میں ہوا وہاں قصابوں نے رات بھر شور مچائے رکھا کہ ہم جلسہ نہیں ہونے دیں گے اور فجر کی اذان تک یہی عالم رہا۔ اُدھر قصابوں کے پاس چھُریاں اور کلہاڑیاں تھیں اِدھر شاہ جی ڈٹے ہوئے تھے، آخر فسادیوں کو جانا پڑا اور شاہ جی نے صبح کی نماز سے ۹ بجے دن تک تقریر کی، اس قسم کی ہنگامہ آرائیاں شاہ جی نے عمر بھر برداشت کیں، بالخصوص نہرو رپورٹ سے لے کر شہید گنج کی تحریک تک اور شہید گنج کی تحریک سے لے کر تحریک پاکستان تک وہ انہی طوفانوں سے گزرتے رہے، اکثر دفعہ قاتلوں سے واسطہ پڑا لیکن قدرت دستگیری کرتی رہی اور وہ ہر معرکہ سے سرخرو نکلے۔ ان پر ایک سخت قسم کا وار بمبئی میں ہوا ایک جانب سے تیزاب میں بجھی ہوئی تیز دھار کی چھُری مجمع کے سروں سے نکلتی ہوئی ان کے سینہ میں پیوست ہوا چاہتی تھی کہ کوہاٹ کے ایک ۲۱ سالہ نوجوان نور خان نے پھُرتی سے بڑھ کر سینہ پر اُٹھالی، نتیجتہً وہ نوجوان اس کے مہلک وار سے انتقال کر گیا۔

مئی ۱۹۲۳ء میں شاہ جی مدرسہ عربیہ شجاع آباد میں مدعو تھے وہاں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو قاضی احسان احمد سے فرمائش کی، پان نہیں کھلاؤ گے؟ ایک صاحب پاس کھڑے تھے انہوں نے پان پیش کیا اور چلے گئے۔ شاہ جی نے پان کو منہ میں رکھا تو چلا اُٹھے "زہر دے دیا ہے"

فوراً حقہ کا، چہرے کا رنگ سیاہ ہوگیا، ڈاکٹر لچھمن داس ریٹائرڈ سول سرجن رات تین بجے تک زہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے اور اس طرح موت کا وار ناکام ہوگیا۔

میرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان نے بہت سے لوگ ان کے قتل پر مامور کیے لیکن کسی کو کبھی حوصلہ نہ ہوا، آخر میرزا صاحب نے راجندر سنگھ آتش نام کے ایک سکھ نوجوان کو دس ہزار روپے میں خرید کیا۔ پانچ ہزار پیشگی ادا کئے پانچ ہزار بعد از قتل دینے کا وعدہ کیا لیکن راجندر سنگھ آتش نے شاہ جی پر اس راز کا انکشاف کر دیا، دوسری جنگِ عظیم میں راجندر سنگھ آتش منٹگمری سنٹرل جیل میں راقم کے ساتھ قید تھا "پس دیوار زندان" میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

شاہ جی کو زہر کھلانے کی کئی دفعہ کوشش کی گئی لیکن جن لوگوں کو مامور کیا جاتا وہ شاہ جی کے چہرے مہرے سے اتنے مرعوب ہوتے کہ ارادہ توڑ ڈالتے یا انکشاف کر دیتے۔ انہی واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض زندگیاں قدرت کی طرف سے معجزہ ہوتی ہیں جب تک اپنی طبعی زندگی گزار نہ لیں موت ان سے بھاگتی ہے اور کوئی سی تلوار یا سازش ان پہ کامیاب نہیں ہوتی۔

اولاد

شاہ جی کے نو بچے تھے، چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں، سب سے بڑی اولاد سیدہ صفیہ خدیجہ تھیں جو ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں، اس وقت شاہ جی میانوالی جیل میں تین سال قید گزار رہے تھے اس بچی کا سوا مہینہ ہی میں انتقال ہو گیا، دوسری بچی سیدہ صالحہ بانو ایک برس کی عمر پا کر رحلت کر گئی، تیسری سیدہ ام کلثوم سوا سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئی، شاہ جی ان دنوں دیناج پور جیل میں چھ ماہ قید گزار رہے تھے سب سے چھوٹی سیدہ سائمہ پونے دو برس کی ہو کر ۱۹۴۸ء میں لقمۂ اجل ہو گئی ان دنوں شاہ جی خان گڑھ میں نواب زادہ نصر اللہ خان کے ہاں مہاجرت کے دن گزار رہے تھے، پانچویں بیٹی سیدہ صادقہ بانو چار بھائیوں کی عابدہ بہن ہیں۔ ان کے میاں سید وکیل شاہ کسی کالج میں تاریخ کے اُستاد ہیں، نہایت درجہ متقی، صالح، فاضل نیک سرشت اور نیک نہاد! سب سے بڑے صاحبزادے سید عطاء المنعم (ابوذر بخاری) مدرسہ خیر المدارس کے فارغ التحصیل ہیں اور آجکل ملتان میں خود ایک عربی مدرسہ چلا رہے ہیں، باقی تین بیٹے سید عطاء المحسن، سید عطاء المہیمن اور سید عطاء المومن باپ نہیں تو باپ کا عکس ضرور ہیں۔ تینوں عربی مدرسوں کے فارغ التحصیل ہیں، کسی بچے کو انگریزی نہیں پڑھائی کہ ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا پڑھانا قطعاً حرام تھا۔ ایک دفعہ راقم نے انگریزی پڑھانے پر زور دیا تو بگڑ گئے فرمایا اس سے بہتر ہے کہ میں انھیں زندہ دفنا دوں۔ پھر انگریزی تعلیم کے خلاف لیکچر جھاڑ ڈالا کہ اس نے مسلمانوں کی نئی پود کو ان کی حمیت سے محروم کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ اس پود کو فنا کر دینے کے حق میں تھے۔

علالت

پروفیسر کرنل ضیاء اللہ نے شاہ جی کا طبی معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کو صدیوں کی عمر دے کر بھیجا تھا لیکن اپنی صحت سے آپ نے انصاف نہیں کیا اور جو کچھ یکایک پیش آگیا ہے اس "مجرمانہ" تغافل ہی کا نتیجہ ہے۔

شاہ جی نے ۱۸-۱۹۱۷ء میں تقریریں شروع کی تھیں لیکن اس وقت امرتسر میں ایک واعظ تھے۔ جونہی جلیانوالہ باغ (۱۹۱۹ء) کا حادثہ ہوا تو سیاسی زندگی میں داخل ہو گئے۔ پھر مرض الموت سے کچھ عرصہ پیشتر تک (۱۲ اگست ۱۹۶۱ء) ریل و جیل اور خطابت و سیاست میں لگے رہے۔ ایام قید، عیدین اور خاص تہواروں کے علاوہ کوئی دن ہوگا کہ آپ نے کسی شہر یا قصبہ میں خطاب نہ کیا ہو۔ عموماً طویل تقریر فرماتے اور جب تک اپنی بات لوگوں کے دل پر نقش نہ کر لیتے تقریر ختم نہ کرتے۔ ان کی بعض تقریریں دس دس گھنٹے بلکہ کئی ایک بیس بیس گھنٹے تک چلی گئیں لیکن کوئی سی تقریر بھی تین چار گھنٹے سے کم نہ ہوتی، ہر جلسہ کے آخر میں تقریر کرتے ان کی نوے فیصد تقریریں دوسرے مقرروں کے بعد رات بارہ بجے شروع ہوتیں اور اذان فجر تک چلتیں۔ جس شخص کو اس قسم کا سفر عنفوان شباب سے لے کر عمر کے آخر دور تک پیش آیا ہو اور زندگی بسر کرنے کے جو اصول ہوتے ہیں ان سے غفلت کی ہو اس کا ۷۲ سال کی عمر میں مرجانا کوئی سانحہ نہیں اس عمر تک زندہ رہنا معجزہ تھا۔

شاہ جی ہندوستان کی تقسیم کے برگ و بار سے اتنے ملول تھے کہ روز بروز ان کی صحت ڈھلتی گئی۔ اس کے بعد اپنے آپ کو کبھی صحت مند نہ پایا ——— ختم نبوت کی تحریک ۱۹۵۳ء میں سکھر جیل میں تھے پہلی دفعہ معلوم ہوا ذیابیطس لگی ہوئی ہے۔ ۱۶ نومبر ۱۹۵۴ء کو نماز عشاء کے لئے وضو کر رہے تھے کہ انہیں اپنی انگلی پر فالج کا اثر محسوس ہوا۔ فرمایا، میں کلمہ پڑھنے لگا اور انگلی پر لا نبی بعدی کا ورد کر کے پھونکتا رہا اللہ تعالیٰ نے فوراً شفا بخش دی۔

۲ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا لیکن شدید حملہ ہوا اس حملہ سے بے بس ہو گئے،

ان دنوں آپ کے معالج ملتان کے حکیم عطاء اللہ خان تھے پھر اسی سال ۱۶ مارچ کو حملہ اور شدید ہو گیا اس حملے نے زبان اور گلے کو معطل کر دیا۔ عقیدت مندوں کو پریشانی ہوئی، بیماری شاہانہ، علاج فقیرانہ، فقر و فاقہ کہاں متحمل ہوتے؟ دوستوں نے مل ملا کے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ہسپتال کی جنرل وارڈ میں داخل کرا دیا۔ لاہور خبر پہنچی تو راقم نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سیکرٹری مسٹر قدرت اللہ شہاب کے نام ذیل کا خط لکھا۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء

برادر مکرم،

سلام مسنون۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری عمر کی آخری منزل میں ہیں کئی عوارض نے انہیں گھیر رکھا ہے، کسی نہ کسی طرح نشتر ہسپتال ملتان میں داخل مل گیا ہے، ہم سب ڈاکٹروں کی خصوصی توجہ کے ممنون ہیں۔

چونکہ ایک پورے عہد پر شاہ جی کے احسانات ہیں اس لئے دستک دے رہا ہوں کہ اس متاع عظیم کو عمر کی اس ویرانی میں آپ بے توجہی کا شکار نہ ہونے دیں گے، اگر آنجہانی استعمار کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو نشتر ہسپتال کی مجلس منتظمہ کو اس گرتی ہوئی تاریخی دیوار کی پشتیبانی کی ہدایت فرمائیں، والسلام۔

آپ کا مخلص

(شورش کاشمیری)

بشرف نظر،

جناب قدرت اللہ شہاب سی ایس پی،

سیکرٹری صدر مملکت پاکستان

پریذیڈنٹ ہاؤس، راولپنڈی

ادھر ہسپتال میں شاہ جی کے معالج پروفیسر ڈاکٹر عالمگیر تھے وہ میرے عزیز تھے، ایک

خط اسی روز انہیں بھی لکھا۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء

برادر مکرم،

سلام مسنون۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمارے قافلہ گمشدہ کی متاع عظیم ہیں، آپ کے زیر علاج ہیں۔ مرحوم ماضی پر ان کے احسانات کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی تمام مسیحائی ان پر صرف کر دیں۔ یہ خط میں خورشیدہ (راقم کی اہلیہ) کے کہنے پر لکھ رہا ہوں وہ کہتی ہے کہ میرے ماموں ہمارے روحانی مرشد کا علاج اپنی صحت کی قربانی پر بھی کریں گے، والسلام

آپ کا مخلص

(شورش کاشمیری)

بشرفِ نظر،

پروفیسر ڈاکٹر محمد عالمگیر

نشتر میڈیکل کالج

ملتان۔

تیسرا خط اسی دن ملتان کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس میاں محمد عباس کو لکھا جن سے احقر کا تھوڑا بہت دوستانہ علاقہ تھا۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء

برادرم میاں صاحب،

سلام مسنون، اگر کوئی سرکاری مصلحت مانع نہ ہو تو ازراہِ کرم نشتر ہسپتال میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی عیادت فی نفسہٖ فرمائیں۔ یہ آپ کا تاریخ کے ساتھ ایک دوستانہ تعلق ہوگا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں آپ کو یہ خط صحیح لکھ رہا ہوں یا غلط؟ بہرحال دوستی کا تقاضا

اس راستہ کی سفارش بن گیا ہے ۔ والسلام

آپ کا مخلص
(شورش کاشمیری)

بشرفِ نظر،
میاں محمد عباس صاحب
ایس ایس پی ، ملتان

مسٹر قدرت اللہ شہاب نے اپنے خط بتاریخ ۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء بحوالہ ڈی ۔ ۲۸۷۲ ۔ ۱۹۶۱ء میں محولہ بالا خط کا جواب دیا۔

برادرم ، اسلام علیکم،
نوازش نامہ ملا ۔ عرصہ سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی علالت کی خبریں آرہی تھیں ، جب یہ حالات صدر مملکت کے نوٹس میں لائے گئے تو انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر شاہ صاحب منظور فرمائیں تو علاج کے لئے ان کی خدمت میں کوئی مناسب ماہانہ بھی پیش کیا جائے چنانچہ میں نے ایک آفیسر کو ملتان بھیجا اور شاہ صاحب کی منظوری حاصل کر کے ان کے نام ہدیتہً ماہانہ جاری[1] ہو چکا ہے ۔
آپ کا خط آنے پر میں نے پرنسپل نشتر کالج کو آج ہی لکھ دیا ہے کہ وہ شاہ صاحب کے علاج پر خصوصی توجہ دیں ۔ اور اس سلسلہ میں اگر کسی خاص مہنگے علاج کی ضرورت ہو تو اس سے گریز نہ کریں اور اخراجات کا بل ہمیں بھیج دیں ۔

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے ، والسلام
نیازمند
قدرت اللہ شہاب
معتمد برائے صدر

جناب آغا شورش کاشمیری
ایڈیٹر ہفتہ وار چٹان ، ۸۸ میکلوڈ روڈ ، لاہور

---

[1] شاہ جی نے نقد روپیہ وصول کرنے سے بشکریہ انکار کر دیا تھا ۔

۳،اپریل ۱۹۶۱ء کو لیفٹیننٹ کرنل اے ایف حسین ایڈمنسٹریٹر نشتر میڈیکل کالج وہسپتال نے مسٹر قدرت اللہ شہاب کو شاہ جی کے بارے میں ذیل کی رپورٹ بھیج دی۔

بحوالہ ۸-۵۱۰۸ این ایچ بتاریخ ۳،اپریل ۱۹۶۱ء

شہاب صاحب نے اس کی نقل راقم کے نام بھجوادی۔ بحوالہ ۶۱-پریس ۳۲۶۱ ڈی

بتاریخ ۸،اپریل ۱۹۶۱ء

Copy of D. O letter No. 5108/N. H. dated 3rd April, from Lt. Col. A. F. Hussain, Nishtar Medical College and Hospital, Multan to Mr. Q. U. Shahab, Secretary to the President.

Your letter No. 2159—Press/61 dated the 29th March, 1961, addressed to the Principal Nishtar Medical College, Multan, was received by the Chairman, Academic Council, Lt. Col. Najib Khan, on 1st April, 1961, and passed on to me for disposal today.

Syed Ata Ullah Shah Bokhari, was admitted into this Hospital on 20.3.1961. He is suffering from Diabetes, Thrombotic Phenomenon and Senility. He is under the treatment of Dr. Mohammad Alamgir Khan, M.R.C.P., Professor Clinical Medicine. He is accommodated in a separate room in the ward and given all possible facilities to make him as such comfortable as possible. No special treatment likely to involve any special expenditure would be necessary. I can assure you that every thing possible is already being done and he will "INSHA ALLAH" be looked after in the best possible manner. He is already making some progress.

Regards ———

PRESIDENT'S SECRETARIAT (PUBLIC)

No. D, 3261-Press/61 Dated 8.4.61

Copy with compliments to Shorish Kashmiri Sahib, Editor Chatan, Lahore.

Sd/ (Q. U. Shahab)
Secretary to the President

8th April, 1961.

ترجمہ: آپ کا خط بحوالہ ۲۱۵۹-پریس ۶۱ بتاریخ ۲۹ مارچ بنام پرنسپل نشتر میڈیکل کالج ملتان اکیڈمک کونسل کے چیئرمین لیفٹیننٹ کرنل نجیب اللہ خان کو یکم اپریل کے دن موصول ہوا جو مجھے کارروائی کے لئے دیا گیا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری اس ہسپتال میں ۲۰ مارچ کو داخل کئے گئے وہ ذیابیطس Thrombotic Phenomenon اور Senility کے امراض کا شکار ہیں، پروفیسر ڈاکٹر محمد عالمگیر خان ایم آر سی پی کے زیر علاج ہیں۔

انھیں وارڈ کے ایک کمرہ میں علیحدہ رکھا گیا اور ممکنہ حد تک آرام و راحت کی تمام سہولتیں دی گئی ہیں۔ کسی خاص علاج کے لئے خاص اخراجات کی ضرورت نہیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ علاج کے لئے ممکنہ حد تک توجہ دی گئی ہے اور آئندہ بھی انشا اللہ کوئی سی کمی نہ ہو گی، وہ کسی قدر روبصحت ہو رہے ہیں۔ احترامات

چونکہ شاہ جی کا مزاج انگریزی ادویات کے مطابق نہ تھا، اِدھر اہلِ خانہ بھی یہی چاہتے تھے، اس لئے ہسپتال میں ایک ڈیڑھ ماہ گزار کے گھر آ گئے لیکن چند دنوں بعد حملہ شدید سے شدید ہو گیا۔ لاہور سلطان فونڈری کے مالکان (مولوی محمد اکرم و مولوی محمد اسلم[1]) ملتان گئے اور وہاں سے اُٹھا کر لاہور لے آئے۔ وہ شاہ صاحب کے عقیدت مند تھے یہاں اپنے بنگلے واقع ماڈل ٹاؤن بی بلاک کوٹھی نمبر ۷ میں رکھا۔ کرنل ضیاء اللہ اور ڈاکٹر محمد یوسف کا علاج ہونے لگا۔ ان کے علاوہ حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیر واسطی، حکیم نبی احمد سویدا وغیرہ سے بھی معائنہ کرایا لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

۲۷ یا ۲۸ جولائی ۱۹۶۱ء کو اعزہ لاہور سے واپس ملتان لے گئے لیکن شاہ جی اتنے بوڑھے ہو چلے اور مرض اتنا جوان ہو گیا تھا کہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت کے مصداق ہو گئے۔

وفات

آخر ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو چھ بجکر ۵۵ منٹ پر سناؤنی آ گئی کلمہ طیبہ پڑھا اور اردو زبان کا یہ سب سے بڑا خطیب جس نے ایک تہائی صدی تک سیاسی قبرستانوں اور شاعرانہ ہمدوں

---

[1] دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

میں اذانیں دی تھیں، خالقِ حقیقی سے جا ملا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ریڈیو نے ملک بھر میں خبر پھیلا دی، پاکستان کے کونے کونے سے لوگ ملتان میں جمع ہونے لگے، ۲۲ اگست کی سہ پہر تک تقریباً ۲۵ ہزار افراد مختلف شہروں سے ملتان میں وارد ہو گئے۔

جنازہ

کوئی ساڑھے تین بجے بعد نماز ظہر جنازہ اُٹھایا گیا، اس وقت ٹبّی شیر خان جہاں شاہ جی رہتے تھے کی تمام سڑکیں، میدان، گلیاں، مکان اور چھتیں لوگوں سے اٹی ہوئی تھیں، جنازہ کے چاروں طرف آٹھ بانس لگا دیئے گئے ـــــ ہر شخص کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک میل لمبا جنازہ کا جلوس تھا اور کوئی دو لاکھ آدمی شریک تھے، شاہ جی کے فرزند اکبر سید ابوذر بخاری نے ساڑھے چار یا پانچ بجے شام نماز جنازہ پڑھائی، حکام ضلع کے علاوہ اکابر شہر اور قرب وجوار کے علماء وصوفیا بھی جنازہ میں شریک تھے۔ کوئی ساڑھے چھ بجے شام انسانی عظمتوں اور شرافتوں کا یہ پیکر باغ لنگے خان کے نزدیک جلال باقری کے مشہور قبرستان میں ابدی نیند سو گیا۔ اس وقت لوگوں کے صدمے اور رقت کا یہ حال تھا کہ دُور دُور تک آنسوؤں کا سیل اور چیخوں کا طوفان اُمڈا ہوا تھا۔

مسٹر بی اے قریشی کمشنر ملتان نے ملک امیر محمد خان کالا باغ کی ہدایت پر ملتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کرنے کی پیشکش کی بلکہ اصرار کیا لیکن شاہ جی کے فرزندان ارجمند نے اس عذر پر انکار کر دیا کہ وہ اپنے باپ کو مسلمانوں سے الگ کسی امتیازی جگہ میں دفن کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔

تعزیت

شاہ جی کی رحلت پر میرزائیوں کے سوا پورا ملک سوگوار تھا۔ اسی رات قاسم باغ میں تید المثال تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی جالندھری، ماسٹر تاج الدین انصاری

قاضی احسان احمد، مولانا عبدالرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، شیخ حسام الدین اور آغا شورش کاشمیری نے اپنے جلیل المرتبت قائد کو خراج ادا کیا۔ اس وقت مجمع ڈھائیں مار مار کر رو رہا تھا۔ آغا شورش کاشمیری نے کالونی ملز ملتان کے میرزائی مالکوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی جو اس وقت بھی اپنی کسی تقریب میں فلمی دھنوں کے ریکارڈ بجا رہے تھے، اور جن کے لئے شاہ جی رحلت اس سال کا لمحۂ مسرت تھا۔

ارادت

شاہ جی کی وفات پر ملک بھر میں ماتم کیا گیا۔ تمام اخبارات نے اداریئے لکھے ہندوستان میں خبر پہنچی تو وہاں دینی حلقوں نے ماتم کیا اور سیاسی حلقوں میں اندوہ کا اظہار کیا گیا فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کہا کہ :

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے"۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا:

وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے تعزیت کے خط میں لکھا کہ:

"زمانہ ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گیا جس کا وجود اس برعظیم کے لئے ایک عظیم عطیہ تھا۔ تاریخ ان کے مقام کا فیصلہ ضرور کرے گی لیکن ہمارے دل ان کے مقام کا تعین کر چکے ہیں کہ ان کی رحلت سے آنکھیں اشکبار ہیں نہ جانے اب ان سے کہاں ملاقات ہو گی"۔

قید و بند

"زندگی ہی کیا ہے؟ تین چوتھائی ریل میں کٹ گئی، ایک چوتھائی جیل میں جتنے دنوں باہر رہا لوگ گلے کا ہار ہوتے رہے آج کلکتہ کل ڈھاکہ، ڈھاکہ سے لکھنؤ، لکھنؤ سے بمبئی پھر آگرہ، آگرہ سے دہلی، دہلی سے لاہور، لاہور سے پشاور، پشاور سے کراچی۔ ذرا ہندوستان کے دیہات اور قصبات کا اندازہ کر لو، ہر کہیں گھوما پھرا ہوں۔ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو چھیاسٹھ تقریریں کی ہوں گی ؏

دن کہیں صبح کہیں شام کہیں رات کہیں

"میں نے تقریر کی لوگوں نے کہا "واہ شاہ جی واہ" میں قید ہو گیا لوگوں نے کہا "آہ شاہ جی آہ" اور واہ و آہ میں ہم ہو گئے تباہ۔"

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

اجتماعی قید

شاہ جی کی کل قید آٹھ اور نو سال کے لگ بھگ ہے، پہلی دفعہ آپ تحریک خلافت میں زیر دفعہ ۱۲۴ الف ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء کو بمقام امرتسر پکڑے گئے اور تین سال با مشقت قید کی سزا پائی جو تمام بھگتی۔ دوسری دفعہ راج پال کے فتنہ کی سرکوبی میں ۶ جولائی ۱۹۲۷ء کو گرفتار ہوئے اور ایک سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے نمکین ستیہ گرہ کا

آغاز کیا تو مولانا ابوالکلام آزادؒ اور پنڈت موتی لال نہرو کی خواہش پر تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ خیبر سے کلکتہ تک پولیس نے تعاقب کیا لیکن آپ جل دے کر نکل جاتے رہے۔ آخر ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء کو دیناج پور میں پکڑے گئے اور ۲۰ اکتوبر کو چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ یہ تمام عرصہ آپ نے ملی پور اور ڈمم ڈمم جیل میں گزارا۔ ۱۹۳۲ء میں احرار نے تحریک کشمیر چلائی تو اس کی پاداش میں دھر لئے گئے اور دو سال جیل میں رہے۔

میرزائیت کا محاسبہ شروع کیا تو انگریزی عہد میں دو دفعہ پکڑے گئے، ایک دفعہ تو مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے تا برخاست عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا اور میرزائیوں کے خلاف ایک تاریخی فیصلہ لکھا۔ دوسری دفعہ قادیان میں داخلہ کی پابندی توڑی اور تین ماہ کے لئے سزایاب ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے چند دن پیشتر سردار سکندر حیات کی وزارت نے $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$، ۱۲۱، ۱۲۴ اور ۱۵۳ الف ایسی سنگین دفعات کے تحت گرفتار کر لیا اور دو جگہ مقدمات دائر کئے گئے، راولپنڈی اور گجرات! لیکن پولیس رپورٹر لدھا رام نے بھانڈا پھوڑ کر وزارت کی سازش کو چوپٹ کر دیا۔ چھ ماہ جیل میں رہ کر بری ہو گئے۔

پاکستان میں تحریک ختمِ نبوتؐ کی پاداش (۱۹۵۳ء) میں پکڑے گئے۔ ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں راتوں رات پولیس نے گرفتار کیا اور سندھ کی مختلف جیلوں میں سیکورٹی ایکٹ کے تحت محبوس رکھا۔ کوئی ایک سال بعد مرافعہ دائر ہونے پر لاہور ہائی کورٹ کے احکام سے چھوٹ گئے۔

مئی ۱۹۵۶ء میں آپ کو ملتان کے حدود میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ جولائی کے اواخر میں ڈاکٹر خان صاحب نے ان احکامات کو منسوخ کر دیا۔ خانیوال اور ملتان میں ۲۱ سیفٹی ایکٹ کے تحت دو مقدمے چلائے گئے مگر آخر سرکار نے واپس لے لیے۔

تربیت گاہ

جیل خانے میں قیدی کی نفسیات عجیب وغریب ہوتی ہیں، جہاں تک ان کی معنوی خصوصیت کا تعلق ہے وہ تو ہر قیدی کے باب میں یکساں ہے لیکن مختلف طبائع مختلف اثرات اخذ کرتی ہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں اجتماعی قید وبند نے بہت سے لوگوں میں ادب وسیاست اور فکر ونظر کی وسعتیں پیدا کیں، ہر شخص بقدر استعداد ایک دوسرے سے مستفید ہوتا اور ذہناً پروان چڑھتا تھا، انہی صحبتوں سے سیاسی ذہن میں استقلال پیدا ہوتا تھا اور مزاج میں پختگی آتی تھی اس دور کے بیشتر راہنماؤں اور بہت سے سیاسی کارکنوں کی سیاسی معراج جیل خانے کی ان صحبتوں ہی کے فیضان کا نتیجہ تھی البتہ قید تنہائی غور وفکر کی عادی طبیعتوں کے سوا عام حالات میں مہلک ثابت ہوتی اس سے مزاج میں تہور پیدا ہوتا یا پھر غصہ جھنجلاہٹ اور چڑچڑا پن نشوونما پاتے تھے۔

شاہ جی جب کبھی قید ہوئے عام جماعتی رفقاء سے ان کا ساتھ رہا۔ اگر کبھی علیحدہ رہنا پڑا تو اپنی انجمن خود بنالی، جہاں گئے اپنی باغ وبہار طبیعت ساتھ لے گئے۔ ان کی شخصیت کے گرد بڑائی کا ایک خاص ہالہ بنا ہوا تھا جس سے ہر کوئی ان کے احترام پر مجبور تھا۔ قیدی سے لے کر افسر تک سب ان کی طرف کھنچتے اور عزت کرتے تھے ــــــ "سکندر وزارت" کے عہد میں راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ کرنل ہاڈر آپ کا گرویدہ تھا۔ معلوم تھا کہ شاہ صاحب انگریزوں کے کٹر دشمن ہیں لیکن وہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہی نہیں مرعوب تھا۔ اس نے آپ کو بیڈمنٹن کھیلنے پر آمادہ کیا۔ شاہ جی جب تک راولپنڈی جیل میں رہے وہ ہر شام آپ سے بیڈمنٹن کھیلا کرتا۔ اس نے بہ عنوان "ہندوستان کی یادیں" ایک کتاب لکھی ہے جس میں اپنے بعض مطالعات وتجربات کا ذکر کیا ہے۔ شاہ جی کے متعلق لکھا ہے کہ:

"جن قیدیوں نے مجھے اثنائے ملازمت میں متاثر کیا ان میں عطا اللہ شاہ بخاری نام کا ایک سیاسی قیدی بڑی ہی دلفریب شخصیت کا مالک تھا، اس کا چہرہ مہرہ چرچ کے ان مقدس راہبوں کی طرح تھا جن کی تصویریں یسوع مسیح سے مشابہ ہوتی ہیں۔ یا پھر ان مستشرقین کی طرح جنہیں یورپ میں خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم اسے عرب کے بڑے بڑے قاموسیوں سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں لیکن ان کے صحیح شناسا ہمارے ہاں کتنے ہیں؟ میں اسے اپنا دوست بنانا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان سب سے بڑی روک ہماری مختلف زبانیں تھیں۔ میں تو اس کی زبان کچھ نہ کچھ سمجھ ہی لیتا تھا لیکن وہ انگریزی سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ ۱۸۵۷ء کے اس "اینٹی برٹش" ذہن کی باقیات میں سے تھا جنہیں ہمارے پیشرووں نے علماء کو پھانسی دے کر پیدا کیا تھا۔"

یادہائے رفتہ

شاہ جی تحریک خلافت کے ایام اسیری کا ذکر بڑی حسرت اور مسرت سے کرتے تھے ان کی رائے میں وہ دن ان کی زندگی کا حاصل تھے۔ تمام ملک مولانا ابوالکلام آزادؒ کے الفاظ میں ایک بڑا جیل خانہ بن چکا تھا۔ بالخصوص پنجاب کے قید خانے اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کا دارالعلوم تھے۔ شاہ جی سزایابی کے فوراً بعد لاہور جیل میں رکھے گئے۔ جہاں ان کے ساتھ بابا گوروت سنگھ، لاجپت رائے، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا ثناء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خان، سردار سردول سنگھ کولیشر، راجہ غلام قادر خان، سردار منگل سنگھ، پنڈت نیکی رام شرما اور بعض دوسرے لوگ بھی محبوس تھے۔ کچھ دنوں بعد لالہ لاجپت رائے کے سوا گیارہ نفوس کا یہ قافلہ میانوالی جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں مولانا احمد سعید دہلوی اور ڈاکٹر ستیہ پال پہلے سے موجود تھے۔ ایک بزم آراستہ ہو گئی۔ اس قید و بند کے حالات مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی "سرگزشت" میں تفصیل سے لکھے ہیں، ملاحظہ ہو:

"جیل میں ایک احاطہ تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ میں چار کوٹھڑیاں تھیں۔

اس کو "منڈے خانہ" یعنی لڑکوں کا احاطہ کہتے تھے اور ایک حصے میں ایک بڑا اور کھلا کمرہ تھا جس میں سات آٹھ قیدیوں کے لئے گنجائش تھی چونکہ یہ کمرہ قید محض (یعنی بے مشقت) والے قیدیوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا اس لئے کمرہ کہلاتا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک درمیانی دروازے سے ملے ہوئے تھے۔ اختر علی خان، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا داؤد غزنوی، عبدالعزیز انصاری، عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ، صوفی اقبال، راجہ غلام قادر خان، مولانا عبداللہ چوڑی والے دہلوی، میں اور نذیر احمد سیماب محض کمرے" اور "منڈے خانے" میں بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں ہمارے باورچی خانے کا انتظام کر دیا گیا۔ سردار سردول سنگھ کوشیر، سردار منگل سنگھ اور ان کے دو ہندو ساتھی ہندو لیڈروں کے احاطے میں بھیج دیئے گئے جس میں اب ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ گردھاری لال امرتسری، لالہ تلوک چند، دیش بندھو گپتا (تیج) اور متعدد مشہور کارکن آ گئے تھے۔

چند ہی ہفتوں میں میانوالی جیل سیاسی قیدیوں سے معمور ہو گیا اور رضا کاروں کے احاطوں سے قومی نعروں کی دلآویز صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پڑھے لکھے قیدیوں نے مطالعہ وغیرہ کا مشغلہ اختیار کیا۔ چنانچہ ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا صبح اُٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے، نماز باجماعت ادا کی اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادب عربی صرف و نحو عربی اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے، مولوی لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہو گئے یعنی فلاں فلاں مطلوبہ چیز کیونکر چوری چھپے باہر سے منگوائی جائے اور فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے اور یہ چوری چھپے کے کام بھی انہی کے سپرد تھے چنانچہ میں نے اُن کا لقب "اُمام السارقین" مقرر کیا تھا، سید حبیب بعض وجوہ سے ہمارے ساتھ نہ ٹھہر سکے اس لئے دوسرے احاطے میں چلے گئے تھے۔ ایک زمانہ میں وہ مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور مولانا داؤد سید حبیب کو عربی پڑھاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کو انگریزی

آئی تو ان کو عربی ــــ خیر یہ دن بھر کا پروگرام عرض کر رہا تھا۔ صبح ہم تھوڑی سی مشقت بھی کرتے تھے یعنی چرخے یا پانچ تار کا سوت (صرف بقدر دو چھٹانک)، دری بافی کے لئے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کوئی بیس منٹ کا کام تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ایک بجے تک جاری رہتا۔ اس وقت مولانا عبد اللہ چوڑی والے للکار کے کہتے "ارے بھائی! کھانا تیار ہے" اگرچہ ہمارا کھانا پکانے پر مشقتی قیدی مقرر تھے لیکن ہم نے باورچی خانے کا چارج مولانا عبد اللہ کو دے رکھا تھا۔ اور انہوں نے اپنے فرائض مفوضہ کو جس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنی مہارت فن سے دہلی کے وہ وہ کھانے پکا کر ہمیں کھلائے کہ "جیل کو دیکھ کے گھر یاد آیا" سب اکٹھے بیٹھ کر لطف کے ساتھ کھانا کھاتے اور قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر اور عصر کے بعد چائے کا دوسرا دور جاری ہوتا۔ مغرب کے بعد کھانا کھایا جاتا اور عشاء کے بعد بھی دیر تک بحث مباحثے جاری رہتے۔ کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے، صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبد العزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل، صوم وصلوٰۃ، تلاوت قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھڑیوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ "حضور ہمیں یہاں سے کہیں اور بھیج دیجیے یہ مولبی" لوگ ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے"۔

اب ہمارے کمرے میں ایک قابل قدر شخصیت کا اضافہ ہو گیا تھا دہلی کے مولانا عبد اللہ چوڑی والے آچکے تھے اور ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی شگفتگی دوستوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ مولانا دہلی کے نہایت ممتاز قومی کارکن ہونے کے علاوہ مختلف قسم کے دہلوی کھانے پکانے میں بڑے ماہر تھے چنانچہ مولانا احمد سعید کی استدعا پر انہوں نے ہمارے باورچی خانے کا چارج لے لیا۔ اور اسی دن سے

ہمارے دسترخوان کی لذتوں میں اضافہ ہو گیا۔ کہیں کھڑے مسالے کا قورمہ پک رہا ہے کبھی میٹھے ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں، کبھی پُر تکلف قبولی کھچڑی تیار ہو رہی ہے۔ کبھی ماش کی پھریری دال دسترخوان پر آ رہی ہے۔ چونکہ ہمیں دو چھٹانک فی کس کے حساب سے گھی ملتا تھا اور معمولی کھانوں میں استعمال ہونے کے بعد بچ رہتا تھا اس لئے مولانا عبداللہ اس کا خشک حلوا تیار کر لیتے تھے اور اس کے قتلے کاٹ کاٹ کر سب دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ حلوا عام طور پر تیسرے پہر کی چائے کے ساتھ کھایا جاتا تھا۔ مولانا عبداللہ کی عمر تو اس وقت سینتیس اڑتیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن سر اور داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی فرنچ کٹ تھی اور سُرخ و سفید رنگت پر بہار دیتی تھی۔ پرلے درجے کے ہنسوڑ اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور دلچسپ واقعات اور لطیفے سنا کر ہم سب کا دل بہلاتے تھے۔

یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے اُستاد بھی تھے۔ عبدالعزیز انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں میرے ہم سبق تھے۔ لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خان سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے لیکن جو خصوصیت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی وہ اپنے رنگ میں مثال نہ رکھتی تھی شاہ صاحب اس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اُردو اور فارسی میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکہ خصوصی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شگفتہ طبع، ان کا خلوص، ان کی محبت پروری بے مثال تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ رات کے وقت دوسرے احباب خوابِ غفلت میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں اور میں اور شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے۔ خدا جانے وہ کون سے موضوع تھے جس پر اس قدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں لیکن دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔

جیل کی زندگی میں لطیفوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دن شاہ صاحب نے قصہ سنایا کہ پٹنہ میں ایک مولوی صاحب وعظ فرما رہے تھے جس میں "لا تنابزوا بالالقاب" کی تفسیر

کے سلسلے میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کی چڑ مقرر نہ کرنی چاہیئے جس سے دوسرا شخص چڑ جائے۔ مجلس واعظ میں ایک مقامی تحصیل دار صاحب بیٹھے تھے انہوں نے پاس بیٹھتے ہوئے ایک صاحب سے کہا، لوگ یونہی چڑ جاتے ہیں اگر کوئی شخص کسی کو چڑانے کی کوشش کرے اور وہ نہ چڑے تو کوئی بات نہیں مخاطب نے جواب دیا، نہیں حضرت چڑ کی بات سے آدمی چڑ ہی جاتا ہے، اس سے تغافل کرنا بڑا مشکل ہے۔ تحصیل دار صاحب قائل نہ ہوئے تو دوسرے شخص نے خاموشی اختیار کر لی، دو چار منٹ گزرے تھے کہ اس شخص نے تحصیلدار صاحب سے پوچھا، کیوں صاحب! آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے، جواب ملا نہیں صاحب، میرے ہاں شلجم کا اچار نہیں ہے۔ کوئی دو منٹ کے بعد اس نے پھر سوال کیا، کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے؟ تحصیلدار صاحب نے جواب دیا کہ میں عرض کر چکا ہوں نہیں ہے، یہ بہت خوب کہہ کر پھر چپ ہو گئے۔ لیکن ابھی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پھر پوچھا، تحصیل دار صاحب، آپ کے ہاں شلجم کا اچار تو ہوگا۔ تحصیل دار صاحب برہم ہو گئے اور کہنے لگے کیا آپ نے مجھے مسخرا مقرر کر رکھا ہے۔ تین دفعہ تو کہہ چکا ہوں کہ شلجم کا اچار نہیں ہے لیکن آپ برابر وہی پوچھتے جا رہے ہیں، اس شخص نے معافی مانگی اور خاموش ہو گیا لیکن ابھی دو ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس نے پھر وہی سوال دہرایا کیوں صاحب آپ کے ہاں شلجم کا اچار ہے۔ اب تحصیل دار صاحب کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا کہنے لگے "عجیب بدتمیز ہو تم"؟ یہ کیا بکواس ہے؟ شلجم کا اچار ہے، شلجم کا اچار ہے، ساری مجلس وعظ ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مولوی صاحب نے وعظ روک دیا اور شخص نے فقط اتنا کہا کہ صاحب میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ شلجم کا اچار ہے۔

تحصیل دار صاحب نے جوتا پکڑ لیا۔ اب آگے آگے وہ شخص اور پیچھے پیچھے تحصیلدار صاحب بھاگتے ہوئے مجلس وعظ سے نکل کر بازار میں پہنچ گئے، وہ شخص بار بار پیچھے مڑ کر پوچھتا شلجم کا اچار ہے؟ تحصیل دار صاحب گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے دوڑے، یہاں

تک کہ شلجم کا اچار شہر بھر میں مشہور ہو گیا۔ تحصیل دار صاحب جدھر سے گزرتے لوگ بہانے بہانے شلجم کے اچار کا ذکر چھیڑ کر ان کو چڑاتے اور وہ چڑ کر گالیاں بکتے۔ لطیفہ نہایت دل کش تھا۔ دن بھر باریوں میں اس کا چرچا رہا۔ تین چار دن کے بعد دوستوں نے سازش کی کہ سید عطاء اللہ شاہ کو چڑایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے صوفی اقبال احمد شاہ جی کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچے اور انگشت شہادت سے اشارہ کر کے پوچھا، شاہ جی آپ کے پن ہو گی، شاہ جی نے کہا نہیں بھائی میرے پاس پن نہیں ہے۔ کوئی ایک منٹ کے بعد اختر علی خان پہنچے اور اس طرح انگشت شہادت کے پورے سے اشارہ کر کے پوچھا کیوں شاہ جی آپ کے پاس پن ہو گی، شاہ جی نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ پن نہیں ہے۔ دو منٹ کے بعد ایک اور صاحب پہنچے، شاہ جی پن ہے؟ شاہ جی کے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ باہر نکل آئے اور کہنے لگے کیا تم سب کے ٹانکے اُدھڑ چکے ہیں کہ بار بار باری آ کر مجھ سے پن مانگتے ہو، اتنے میں ایک اور دوست پہنچ گئے اور نہایت متانت سے فرمانے لگے شاہ جی آپ کے پاس پن تو ہو گی؟ شاہ جی نے انہیں بھی اسی طرح ڈانٹا اس کے بعد جو ہر طرف سے شاہ جی پن ہی کے سوالات شروع ہوئے تو شاہ جی اتنے غصے میں آئے کہ مادر و خواہر کی مغلظات تک سنا دیں۔ خیر ہم نے بڑی کوشش اور خوشامد و آمد سے ان کے غصے کو ٹھنڈا کیا اور بتایا کہ ہم تو صرف شلجم کے اچار والے لطیفے کو دہرا رہے تھے۔

جیل یا کھیل

جو لوگ شاہ جی کے ساتھ جیل خانے میں رہے ان کا بیان ہے کہ شاہ جی قید کو کبھی سیریس (SERIOUS) نہیں لیتے تھے، جیل خانے کی چار دیواری میں ان کے قہقہے زیادہ وسیع ہو جاتے، اکثر ہندو نوجوان جو جیل میں ساتھ رہے آپ کی باغ و بہار طبیعت کے انتہائی گرویدہ تھے بالخصوص کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان جو ان کی شخصیت سے پیار کرتے لیکن خطابت سے خوف کھاتے تھے۔ مشہور ٹیررسٹ قیدی شیر جنگ نے ملتان سنٹرل جیل میں

آپ سے ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھا تھا، ایک دن اُس نے سوال کیا:

"شاہ جی، قرآن میں یہ تو درج ہے کہ مسلمان آزاد رہ کر اس طرح زندگی بسر کریں لیکن یہ کہیں درج نہیں کہ غلام ہوں تو کیونکر زندگی گزاریں؟ سارے قرآن میں مسلمان اور غلامی کہیں بھی اکٹھے نہیں ہیں، آخر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟"

یہ بات شاہ جی کے دل میں اُتر گئی۔ پھر کیا تھا مدت العمر عام جلسوں میں مسلمانوں سے اس کا جواب پوچھتے پھرے۔

ایک سوشلسٹ نوجوان نے جو آپ کے ساتھ قید میں تھا سوال کیا:

شاہ جی آپ نے کبھی نماز ترک نہیں کی اور نہ کبھی روزہ چھوڑا؟ پھر آپ کا دل عام نمازیوں کی طرح سخت کیوں نہیں؟

شاہ جی مسکرائے، فرمایا بھائی جو مذہب انسان کے دل کو گداز نہیں کرتا وہ مذہب نہیں سیاست ہے اور مجھے ایسی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

شاہ جی نے جیل میں مونج کوٹی، بان بٹا اور گندم پیسی لیکن عام طور پر مشقت سے بے نیاز ہی رہے، ایک زمانہ میں ٹوپی پہننا چھوڑ دی، کسی نے وجہ پوچھی فرمایا پہلی دفعہ جیل گیا تو جیلر نے ہاتھ بڑھا کر ٹوپی اُتارنا چاہی، میں نے ہاتھ روک لیا اور اُتار کر خود حوالے کر دی، تب سے فیصلہ کیا ہے کہ ٹوپی نہیں پہنوں گا۔ بس یہ چوگوشیہ رومال سر پر رکھتا ہوں۔

اب تو جیل خانوں میں کافی اصلاح ہو چکی ہے ایک زمانہ میں قیدی کو تین ماہ بعد ایک خط لکھنے اور دو ماہ بعد ایک خط وصولنے کا حق ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا جبر تھا نتیجۃً بہت سے قیدی بیرنگ خط لکھتے جو بیرونی سنسر شپ کی وجہ سے پکڑے جاتے اور ان کی سزا کا موجب ہوتے، شاہ جی نے اس کا توڑ پیدا کیا۔ پنڈت کرپا رام برہم چاری کے نام سے اپنے احباب کو دینا ج پور جیل سے اکثر خط لکھتے رہے اور یہ نام سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ترجمہ یا بدل تھا۔

آپ کی قید و بند کا یہ پہلو دلچسپ تھا کہ جب بھی آپ پر کوئی آفت ٹوٹی بفضل تعالیٰ آوارہ ٹکڑے کی طرح نکل گئی مثلاً سکندر وزارت کے ساختہ مقدمات نہایت سنگین تھے ان میں عمر قید یا سزائے موت کی سزائیں تھیں لیکن ؎

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

ان مرحلوں میں لاکھوں انسانوں کی دعائیں آپ کے شامل حال تھیں، ہزاروں افراد جن میں عابد شب زندہ دار سے لے کر زاہد مرتاض تک شریک تھے، آپ کے دعاگو رہے اور بڑے سے بڑا معرکہ سر ہوتا رہا ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

بعض اہل اللہ نے قرآنی وظائف بتا رکھے تھے۔ عمر بھر ان قرآنی وظائف کا ورد کیا۔ آخری عمر میں انہی وظائف کے ہو گئے۔ ان کا بیان تھا کہ اہل اللہ کی توجہ اور قرآن پاک سے ان کے شغف کا نتیجہ ہے کہ انہیں کوئی طاقت سر نہیں کر سکتی اور نہ کسی پخت و پز سے اپنی مرضی و منشا کے مطابق قید میں ڈال سکتی ہے لطیفہ غیبی کہیئے کہ تحریک خلافت کی سہ سالہ قید کے بعد وہ کبھی کسی طویل عرصہ کے لئے اسیر نہ ہوئے۔ جس زمانہ میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلی تو اپنے واضح خیالات کے باوجود کھلا پھرتے رہے۔ پاکستان میں تحریک ختم نبوتؐ کا جو اندوہ ناک نقشہ جما اس قید سے بھی ایک سال کے اندر اندر رہا ہو گئے تقریروں میں گرفت کا عنصر شاذ ہی ہوتا تمام تقریریں مصرعہ ہائے غزل کی طرح اتنی رنگا رنگ ہوتیں کہ انہیں اول تو قلمبند کرنا ہی دشوار تھا، دوم سی آئی ڈی کا محکمہ جن فضلائے عصر پر مشتمل تھا وہ ان الفاظ و مطالب کی پکڑ سے قاصر تھے ان میں مطالب آشنائی کا جوہر ہی نہ تھا۔

سنگین مقدمہ

سکندر مرحوم کی وزارت نے آپ کو جس نازک موقع پر جن سنگین دفعات کے تحت پکڑا

تھا اس کے پیش نظر ہر شخص کو اندیشہ تھا کہ عمر قید سے کیا کم سزا ہو گی۔ لیکن قدرت نے دستگیری کی اور حالات نے معجزاتی طور پر پلٹا کھایا جس رپورٹر (لدھا رام) نے تقریر قلمبند کی تھی وہ ایکا ایکی فرنٹ ہو گیا۔ اس نے لالہ لکھمی داس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گجرات کی عدالت میں ۱۸ دسمبر ۴۹ء کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ شاہ جی کے خلاف جو تقریر پیش کی جا رہی ہے وہ حکومت کے ایما پر فرضی تیار کی گئی ہے چونکہ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں ایک بے گناہ شخص کو بلاوجہ مصیبت میں مبتلا کروں لہذا مجھے اصل حقیقت کے انکشاف کی اجازت دی جائے۔

اس تاریخی بیان نے صورت حالات اُلٹا دی۔ وزارت گھبرا گئی، ایڈووکیٹ جنرل نے ۱۲ فروری ۴۰ء کو ہائی کورٹ میں درخواست گزاری کہ چونکہ اس مقدمہ میں استغاثہ کے گواہ لدھا رام نے صوبہ کے وزیر اعظم سردار سکندر حیات خان کو ملوث کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مقدمہ کی نوعیت بدل گئی ہے لہذا مقدمہ کا فیصلہ عدالت عالیہ میں ہونا چاہیئے۔ جسٹس سکیمپ نے درخواست منظور کر لی؛ چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژن بینچ نے گیارہ مارچ کو سماعت شروع کی اور بارہ مارچ کو مقدمہ لدھا رام کی شہادت کے لیے یکم اپریل پر ملتوی ہو گیا۔ اس اثنا میں لدھا رام روپوش رہا۔ یکم اپریل کو ڈرامائی انداز میں حاضر عدالت ہو گیا۔ اس کی شہادت تین دن جاری رہی جس میں اس نے عجیب و غریب انکشافات کیے۔ عدالت عالیہ نے اسے جھوٹا قرار دے کر شاہ جی کو استغاثہ کی بے اعتبار شہادت کے پیش نظر رہا کر دیا۔ مسٹر ڈی فالشا سیشن جج لاہور نے بھی ۷ جون ۴۰ء کو دوسرے مقدمے میں رہا کر دیا۔

لدھا رام کے بیانات کا خلاصہ یہ تھا کہ جو تقریر اس عدالت میں پیش کی جا رہی ہے وہ بنائی گئی ہے کیونکہ جس شارٹ ہینڈ نوٹ بک پر اس نے تقریر کے حقیقی نوٹ لئے تھے اُسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر جلا دیا تھا۔ اسے کہا گیا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو وزیر اعظم

پنجاب کی ایک خفیہ چٹھی ملی ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری گجرات کے ضلع میں یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آ رہا ہے اس کی تقریر کے نوٹ اس طریق سے لیے جائیں کہ تقریر دفعات ۳۰۲/۱۱ ، اور ۱۵۳ الف کی زد میں آجائے۔ اس کی تعمیل کی گئی پراسی کیوٹنگ انسپکٹر نے ان مختصرات کی بنا پر نئے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوائے اور ان سے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے گئے جن کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہے۔

اس بیان نے سکندر وزارت کی اخلاقی ساکھ کو بے حد نقصان پہنچایا۔ جنگ کا زمانہ نہ ہوتا تو ممکن تھا اس کے نتائج سیاسی اعتبار سے کچھ اور ہوتے مگر جنگ کی وجہ سے بہت سی گرہیں کھلتے کھلتے رہ گئیں تاہم سکندر وزارت کو رسوائی کا داغ سہنا پڑا۔ سر ڈگلس ینگ نے آغاز مقدمہ سے کچھ دن پہلے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے ان کی خواہش پر ملاقات کی۔ مولانا کے علم میں تھا کہ مسٹر ڈگلس اور سکندر حیات میں کسی بات پر شکر رنجی ہے، انہوں نے ساری رام کہانی سنائی، تو سر ڈگلس نے بروایت وعدہ کیا کہ وہ سازش کا کھوج نکال کر دم لیں گے لیکن مولانا سے سوال کیا کہ احرار نے فوجی بھرتی کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا ہے اس کا جواز کیا ہے؟ مولانا سوال کی گرفت سے چوکنے ہو گئے، کہنے لگے ہمارے خلاف جب اس قسم کے خطرناک مقدمات گھڑے جائیں تو اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ فوجی بھرتی کی مخالفت کر کے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں قید ہو جائیں اس طرح یونینسٹ وزارت کی منشا بھی پوری ہو جائے گی اور احرار بھی مقابلۃً جھوٹے مقدمات کی طویل سزاؤں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ القصہ مقدمہ کی بہت سی راہیں سمٹ کر ایک خاص راہ پر آ گئیں نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی بری ہو گئے، سکندر حیات کے دامن پر چھینٹ تک نہ پڑی اور لدھا رام انحراف شہادت میں تین سال کے لیے قید ہو گیا۔

بعض وزارتی راوی لدھا رام کی شہادت کا ایک دوسرا رُخ پیش کرتے تھے، ان کا بیان تھا کہ گجرات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر برار کے خلاف رشوت ستانی کے بعض مقدمات

زیر تفتیش تھے اور اسے معطل کیا جا چکا تھا اس نے ان مقدمات کی واپسی کے لئے وزارت سے بلیک میل کیا یعنی لدھارام کو جو اس کا مرغ دست آموز تھا اس طرح قربان کر کے اپنے آپ کو بچایا، لدھارام کی شہادت کے بعد وہ بھی ایک گواہ ہو گیا کیونکہ وزیر اعظم کی مبینہ چیٹھی پر صحیح روشنی ڈالنے کا مجاز وہی تھا۔ اس نے سودا کیا اور کامیاب رہا۔ اس برأت کے بعد شاہ جی پر قیام پاکستان تک کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ پاکستان بنا تو سیاست سے ذہناً مستعفی ہو گئے لیکن قادیانیوں کا تعاقب جاری رکھا۔ آخر ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں راست اقدام کا فیصلہ کیا تو حکومت نے راتوں رات سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے سکھر جیل میں رکھا۔ ایک بڑے افسر نے آپ سے جیل میں ملاقات کی اور بزم خویش نصیحت کرنے لگا۔

"شاہ صاحب اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے اور انگریز جا چکا ہے مگر آپ ابھی تک پرانے ڈگر پر قائم ہیں بھلا اپنی ہی حکومت کے خلاف ہنگامہ آرائی سے فائدہ؟ سوائے اس کے کہ اسلامی حکومت کمزور ہو؟"

شاہ جی ان بزرگوار کو اچھی طرح جانتے تھے ان کے لہجے کی صاحبی پر مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"جی ہاں میرے علم میں ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن ؏

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

کچھ لوگ اسلامی حکومتوں میں برسر اقتدار ہوتے اور کچھ جیل خانے میں رہتے ہیں، آپ اپنا کام کیجئے ہمیں ہمارا کام کرنے دیجئے، تاریخ اپنے آپ کو اسی طرح دہراتی ہے۔"

تجربہ گاہ

شاہ جی نے جیل خانے میں بڑے سے بڑے تجربے حاصل کئے، فرماتے جیل خانہ ترازو ہے اور کسوٹی بھی، جس سے ہر انسان کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے کسی انسان کا ظرف پرکھنا ہو یا یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ کیا ہے؟ تو اسے دسترخوان یا جیل خانے میں پہچاننے کی کوشش

کرو۔ دونو جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان بولتا ہے اس معیار پر انہوں نے لوں کو پرکھا اور تولا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر افراد کے معاملے میں ان کی رائے بڑی صاف اور پختہ تھی جہاں تک سیاسی تحریکوں میں قید ہونے والے افراد کا تعلق تھا وہ جیل خانے کو تربیت گاہ سمجھتے لیکن اخلاقی مجرموں کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ مختلف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جیل خانے مجرموں کو مزید مجرم بناتے ہیں اور یہاں اصلاح احوال کی توقع ہی عبث ہے جو خرابیاں ایک اخلاقی قیدی کو جیل خانے میں سوجھتی اور سمجھائی جاتی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ایک طرف خطرناک جرم پرورش پاتے ہیں دوسری طرف سزا کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

قانون و سزا کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر حکیمانہ تھا، وہ قانون کو حکیم سولن کے الفاظ میں مکڑی کا جالا سمجھتے جو طاقت ور سے ٹوٹ جاتا اور کمزور کو پھانس لیتا ہے اِن کی نظر میں جرم سے کہیں زیادہ قانون سخت تھا اور سزا کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ محض انتقام ہے اپنی قید و بند کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہ کی اور نہ کسی افسر مجاز کا گلہ کیا۔ جو صعوبتیں پیش آئیں انہیں بچشم قبول کیا۔ البتہ کبھی کبھار تقریر کا رنگ باندھنے کے لئے فرماتے۔

"جیل خانہ میری بیوی کا حق مہر نہ تھا اور نہ وہ عفیفہ خاتون اپنے جہیز میں ساتھ لائی تھی"۔

ان کے گنجلک بالوں کی سپیدی، کھلے ماتھے کی سلوٹوں اور متحرک آنکھوں کی عقبی لہروں پر اچٹتی ہوئی نظریں ڈالتے ہی قید و بند کی ایک ایسی تاریخ سامنے آجاتی تھی جس کا سرنوشت تھا ؎

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

جماعت احرار

شاہ جی اور احرار میں گل و بلبل کا رشتہ تھا، جس طرح خطابت کے بغیر شاہ جی کا تصور نہیں بندھتا اسی طرح شاہ جی کی نفی سے احرار کی تاریخ نصف رہ جاتی ہے دونوں میں جسم و جان کا تعلق تھا۔

تحریک احرار بڑے ہی گہرے تجزیہ کی مستحق ہے جتنا گرد و غبار تاریخ احرار پر ڈالا گیا غالباً اس دور کی کوئی اور تحریک اتنی خاک بسر نظر نہیں آتی۔ اس کے خارجی وجوہ بہت سے ہیں لیکن داخلی وجہ خود احرار ہیں جتنی بڑی بڑی نا انصافیاں ان لوگوں نے خود اپنے ساتھ کی ہیں، ان کا عشر عشیر بھی دوسروں نے ان کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ ان پر رسوائی کی منوں مٹی ڈالی گئی وہ دب گئے۔ لیکن مٹے نہیں، انہوں نے "قلم" کے اس دور کو بھی "زبان" کا دور سمجھا، ان کا خلاصۂ گفتار یہ تھا کہ حال پر جھنجھلائیں، مستقبل کے خواب دیکھیں اور ماضی کے گیت گائیں، نتیجتہً ان کی سیاسی حیثیت ان مزارعین کی سی ہو گئی جو بنجر زمینوں میں ہل جوتتے ان کو پانی دیتے، فصل پکاتے، لیکن کٹائی کے وقت بیدخل ہو جاتے ہیں۔ یا ان معماروں کی طرح تھے جو عمارت تو کھڑی کرتے ہیں لیکن اس میں رہ نہیں سکتے۔

جماعت احرار کو پرکھنے کے لئے کئی تر ازوؤں کی ضرورت ہے احرار کون ہیں؟ انہوں نے کیا کیا؟ ان کے مثبت و منفی کارنامے کیا ہیں؟ جب تک ہم سارے گرد و پیش

کو معلوم نہ کر لیں اور ان حالات و واقعات پر نظر نہ رکھیں جن کا ردعمل احرار تھے اور جو احرار کے ردعمل کا نتیجہ ہیں اس وقت تک ہم احرار پر صحیح تنقید نہیں کر سکتے اور نہ اس انصاف کو قریب لا سکتے ہیں جس کی مورخانہ حیثیت سے ہر لحظہ ضرورت ہے۔

احرار کے متعدد بڑے رہنماؤں کا نام ہندوستان کے ہر گوشہ تک پہنچا اور انہیں ایک گونہ شہرت بھی حاصل ہوئی لیکن وہ کل ہند رہنما کبھی نہ بن سکے ان کا نام تو نمایاں ہی رہا مگر وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جہاں مہاتما گاندھی، قائد اعظم، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور سبھاش چندر بوس براجمان تھے۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے تمام کمالات کے باوجود ہندوستان کے سیاسی راہنماؤں کی صف اوّل میں نہ تھے ان کا اثر مرحوم پنجاب تک محدود رہا۔ اس کے علاوہ وہ سرحد کے دو تین ضلعوں، ریاست بہاولپور، دہلی کے قرب و جوار اور یوپی کے بعض بڑے شہروں میں بھی مقبول تھے لیکن ان کی تحریک یا تنظیم کے ثمرات پنجاب ہی میں تھے ان کے نام اور کام کا تذکرہ کیے بغیر پنجاب کی سیاسی تاریخ مکمل نہیں ہوتی لیکن اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شہروں اور قصبوں میں وہ ایک سیاسی تحریک کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲۔ دیہات میں انہیں ایک تبلیغی جماعت کے طور پر رسوخ حاصل تھا۔

سارا پنجاب ان سے کبھی متاثر نہیں ہوا، شمال مغربی ضلعوں کے لئے صد المصحرا تھے۔

پنجاب کو برطانوی سلطنت میں جو مقام حاصل رہا وہ ظاہر و باہر ہے، چودھری افضل حق کے الفاظ میں "پنجاب برطانوی مقبوضات کی شہ رگ تھا"، انگریزوں نے پنجابی عوام سے بڑے بڑے فوائد حاصل کیے، برطانوی سلطنت کو وسیع اور مضبوط بنانے میں اس صوبہ کی سپاہیوں نے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے، جتنا بہادر اور سستا سپاہی پنجاب سے ملتا رہا اس کی مثال نہیں۔ شاہ جی پنجاب کی اس "وفاداری بہ شرط استواری" پر از راہ تعریض کہا کرتے تھے کہ "فلاں فلاں ضلع کی مائیں تو بچے ہی بابا فرنگی کے لئے پیدا کرتی ہیں"۔ غرض برطانوی ہندوستان

کی غلامی کو برقرار رکھنے کے لئے جو کارنامے اس صوبہ کے بڑے بڑے خاندانوں نے سرانجام دیئے اس سے انگریزی مفاد کو بڑی تقویت پہنچی۔

انوکھی خصوصیت

انگریز ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ حریت میں جان چکے تھے کہ پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جو ہر کڑے وقت میں ان کے استعماری مقاصد کا پشتیبان ہو سکتا ہے لیکن تریسٹھ برس بعد تحریک خلافت نے ہندو مسلم اتحاد کا جو منظر پیش کیا اس سے انگریز خوفزدہ ہو گئے انہوں نے تحریک کے فوراً بعد اس اتحاد کو ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ کر ڈالا۔ اور پنجاب میں تو وہ اس اتحاد کو مطلقاً نہ چاہتے تھے۔ یہاں ہندو مسلم اتحاد تو ایک طرف رہا انہیں مسلمانوں میں کسی آزاد خیال سیاسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود بھی گوارا نہ تھا وہ سیاستہً پنجاب کو برطانوی ہندوستان کی سرحد سمجھتے تھے۔ انہوں نے پنجاب کو فوجی صوبہ بنا ڈالا اور اس کے مختلف عوامل و عناصر کو اس طرح قابو میں رکھا کہ برطانوی مقاصد کے لئے تو وہ مختلف المذاہب ہونے کے باوصف ایک تھے۔ لیکن ملکی مقاصد میں ایک دوسرے کے خلاف تھے چنانچہ اس ضمن میں چند باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔

ا ۔ ہندوستان کے سیاسی رجحانات سے پنجاب کو الگ تھلگ رکھنے کی انتہائی کوشش کی گئی بالخصوص مسلمانوں میں نہ تو کسی مرکزی مسلمان لیڈر شپ کا اثر بڑھنے دیا گیا اور نہ کسی صوبائی انقلابی قیادت کے لئے کام کا راستہ ہموار ہونے دیا۔

ب ۔ پنجاب میں دوسرے صوبوں کی طرح صرف ہندو مسلم مسئلہ ہی پیدا نہیں کیا گیا بلکہ ایک تیسرا مسئلہ سکھوں کا اٹھایا گیا جس سے فرقہ واریت کا عقدہ سہ گونہ ہو گیا۔

ج ۔ ملک کے فرقہ وارانہ مسئلہ میں انگریزی اغراض کے ایما پر جو شدت پیدا ہوتی گئی اس کا سرچشمہ پنجاب تھا۔

د ۔ تحریک خلافت کے ٹھنڈا ہوتے ہی فرقہ وارانہ مناقشات کی جو رو چلی اس کا

سرآغاز کو ہاٹ اور سرچشمہ دہلی تھے لیکن اس کی اصل طاقت پنجاب تھا۔

حقیقی مہرے

ان اغراض کی تکمیل کے لئے جو مہرے کام کر رہے تھے وہ نہایت درجہ خطرناک تھے مثلاً :

۱ ۔ پنجاب کی ہر قوم میں بڑے بڑے زمیندار التزاماً پیدا کئے گئے، ان کا اپنے دوائر میں استبدادی اثر تھا۔

۲ ۔ مسلمانوں پر قابو پانے کے لئے پیروں کی روایتی گدیاں نہ صرف بحال رکھی گئیں بلکہ مزید گدیاں پیدا کی گئیں۔

۳ ۔ بعض سرحدی اضلاع میں کئی لاکھ اور کئی کئی ہزار ایکڑ زمین کا مالک ایک سردار، ایک مہاراجے، ایک خان یا ایک نواب کو بنا دیا گیا۔

۴ ۔ عام لوگوں کو علم سے محروم رکھنے کے لئے بہ لطائف الحیل تعلیمی دروازے بند رکھے گئے۔

۵ ۔ مسلمانوں میں ان لوگوں کا اثر و رسوخ بہ طور خاص پیدا کیا جو برطانوی بساط کے دل پسند مہرے تھے۔

۶ ۔ عام مذہبی پیشواؤں کو مطیع و منقاد رکھا ان کی معرفت اصل اسلام کو مجروح کیا اور چند خاص قسم کی عصبیتوں کو رواج دیا۔

۷ ۔ ملّا کا دین "فی سبیل اللہ" فساد بنا دیا جس سے عام مسلمانوں میں علما و صلحا کی توقیر گھٹتی گئی اور وہ دیہات میں زمینداروں کے کمین شمار ہونے لگے۔

۸ ۔ مسلمانوں میں اسلام کی بنیادی روح ختم کرنے کے لئے خانہ ساز نبوّت پیدا کی گئی اہل طریقت کو بہ لطائف الحیل اس راہ پر ڈالا کہ ان کی گدیاں مسلمانوں کے اندرونی خلفشار اور باہمی تو تکار کا مرکز بن گئیں۔

۹۔ مسلمانوں کی معیشتی زندگی کو نامسلمانوں کے تابع کر دیا گیا عام مسلمانوں میں سے صرف سپاہی لیے گئے یا کلرک، جن چند خاندانوں کے افراد کو آگے لایا گیا وہ پشتینی وفادار تھے یا وہ لوگ تھے جن کا وجود قومی عزت کے منافی تھا ان لوگوں نے انگریزوں سے بڑھ کر برطانوی سلطنت کی بقا کے لیے جاں نثاری کا ثبوت مہیا کیا۔

۱۰۔ پنجابی مسلمانوں کی بیشتر آبادیاں آبائی رسوم کا شکار تھیں، ان کے نام تک مسلمان نہ تھے انہیں کلمہ طیبہ تو ایک طرف رہا السلام علیکم کہنا بھی نہ آتا تھا۔

۱۱۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی اور مجلسی مقاطعہ کر رکھا تھا اور وہ عملاً انہیں غیر ہندوستانی ہی سمجھتے تھے۔

۱۲۔ نیشنل کانگرس کے عام راہنما (مسلم لیگ کے عوامی تحریک بننے سے پہلے) مسلمانوں کو کانگرس میں شمول کی دعوت تو دیتے تھے لیکن عملاً ان پر کانگرس کے دروازے بند رکھتے تھے۔

۱۳۔ صوبہ کے عام باشندے بالخصوص مسلمان حکومت سے اتنے خوفزدہ تھے کہ ایک کانسٹیبل کو بھی حاکم مطلق سمجھتے تھے۔

۱۴۔ جن خاندانوں کو مسلمانوں کی تقدیر کا مالک بنا دیا گیا ان کی تاریخ اتنی شرمناک اور ہولناک تھی کہ اس تاریخ میں ملکی مقاصد سے غداری اور عوام پر جور و ستم کے سوا ایک ورق بھی قومی ہمدردی کا نہیں تھا۔

۱۵۔ مسلمانوں کے اس گروہ کا یہ شعار ہو چکا تھا کہ اس کے ارکان اسلامی ملکوں اور قومی تحریکوں کے خلاف جاسوسی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

۱۶۔ مثلاً، تحریک لاتعاون میں جب خلافتی رضاکار علما کے فتویٰ کی کاپیاں تقسیم کرنے کے لیے سر عمر حیات خان ٹوانہ کے علاقے میں گئے تو ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ رضاکاروں کو اغوا کر کے حاشیہ برداروں میں بانٹ دیا گیا جنہوں نے ان کے ساتھ منہ کالا کیا اس

صدمہ کی تاب نہ لاکر کسی ایک نوجوان نے خودکشی کرلی۔

ضلع میانوالی کی ایک تحصیل میں شاہ جی پہلی دفعہ تقریر کے لیئے گئے تو کسی مسلمان نے اپنے ہاں نہ ٹھہرایا۔ ایک ہندو نے شب بسری کیلئے جگہ دی تو اسے گاؤں چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ تنگ آکر بھاگ نکلا، ازاں بعد اس کے مکان کو آگ لگا دی گئی۔

جس صوبہ کا حال یہ ہو اس میں کسی ایسی تحریک کی بنیاد رکھنا جس کی عنان شہر کے ہنی متوسط طبقے کے ہاتھ میں ہو اور جو "اینٹی برٹش" ذہن بھی رکھتا ہو، ایک دلیرانہ اقدام تھا جس کے عواقب ونتائج کا صحیح اندازہ غالباً خود اس گروہ کو نہ تھا۔

جماعت احرار کی بنیاد

جن لوگوں نے احرار کی بنیاد رکھی ان میں مولانا ظفر علی خان، مولانا داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پیش پیش تھے[۱]

مولانا شوکت علی مرحوم نے ذاتی ناراضی کی بنا پر پنجاب میں خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دیا تو ان پنجابی راہنماؤں نے ۱۹۲۸ء کے اواخر میں علیحدہ تنظیم کے امکانات پر سوچ بچار کیا اور ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو چودھری افضل حق مرحوم کی صدارت میں جماعت احرار کی بنیاد رکھی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری پہلے صدر منتخب کیے گئے، دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا اور اپریل ۱۹۳۰ء میں نمکین ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ احرار ذہناً کانگرس کے ہمنوا تھے انہوں نے اپنی تنظیم کو ادھورا چھوڑا اور کانگرس میں شریک ہو کر سول نافرمانی میں حصہ لینے لگے، گاندھی اروِن میثاق کے تحت عفو عام کا اعلان ہو گیا تو پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے سوا سب قیدی رہا کر دیئے گئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کی صدارت میں آل انڈیا

---

[۱] احرار اسلام کے خطبات اور قرار دادیں صفحہ ۱۲ ماخوذ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۵۴۶

کانگرس کمیٹی کا سالانہ اجلاس کراچی میں ہوا تو اس اجلاس میں احرار راہنما ہندو بنیں کے ضلعی انتخابات کا حشر دیکھ کر شریک ہوئے تھے اور انہیں ہندو سرمایہ کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ جب کراچی میں بھی صورت حالات موافق نظر نہ آئی تو علیحدگی کا ذہن اور پختہ ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں کانگرس سے احرار کی علیحدگی کا سبب ورکنگ کمیٹی میں ان کے نمائندے کی عدم شرکت بیان کیا ہے لیکن چودھری افضل حق مرحوم و مغفور نے تاریخ احرار میں اسے پنڈت جی کی کہہ مکرنی" کہا ہے۔

بہرحال جماعت احرار نے (جولائی ۱۹۳۱ء) اپنی پہلی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں منعقد کی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کانفرنس کے صدر تھے، اس کانفرنس میں کانگرس کی مسلمہ روایت کے خلاف جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا ـــــ تو ہندو پریس نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور احرار کو کانگرس کا باغی قرار دے کر متہم کرنا شروع کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے سوال پر احرار کا ذہن پہلے کی طرح کانگرس سے قریب تھا۔ لیکن ہندو رہنماؤں اور ہندو اخباروں نے احرار کے خلاف اس شد و مد سے پروپیگنڈا کیا کہ پنجابی مسلمانوں میں ان کا وجود ایک فعال عوامی تنظیم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ پہلا مرحلہ تھا جب مسلمانوں میں ہندوؤں سے علیحدگی کا ہمہ گیر ذہن ایک ایسی اجتماعی تحریک سے وابستہ ہو گیا جس نے جان گنتھر کے الفاظ میں مذہب کے راستہ عوام میں سیاسی رسوخ حاصل کیا تھا اور جس کا بدیہی نتیجہ مسلمانوں کا وہ جذبہ تھا جس نے ہندوؤں کی کوتاہ نظریوں سے مشتعل اور منضبط ہو کر پاکستان کی بنیاد رکھی۔ احرار جو کچھ کہتے رہے وہ تحریک پاکستان کے خلاف تھا جو کچھ کیا وہ پاکستان کے حق میں تھا۔

تحریک کشمیر

احرار کی سیاسی زور آزمائیوں میں تحریک کشمیر کو اوّلیت حاصل ہے اس تحریک کے بہت سے برگ و بار تھے مثلاً تحریک کا ایک رُخ یہ تھا کہ:

۱۔ تحریک خلافت کے بعد مسلمانوں نے پہلی دفعہ کسی تحریک میں اس جرأت سے حصہ لیا کہ چالیس پینتالیس ہزار کے قریب لوگ رضاکارانہ طور پر قید ہو گئے۔ کئی نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۲۔ تحریک خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے اور اس تحریک کو تحریک لاتعاون کا اجتماعی ذہن حاصل تھا۔ لیکن تحریک کشمیر محض مسلمانوں کے بل پر اٹھی، اس میں حصہ لینے والے ننانوے فی صد ایک ہی صوبہ کے مسلمان تھے جنہیں ابتداً حکام ریاست کے علاوہ عام ہندوؤں اور نیشلسٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں برطانوی حکومت اور اس کے خود کاشتہ مسلمان امرار کے عناد کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

۳۔ ریاست کے اندرونی راہنماؤں بالخصوص شیخ عبداللہ وغیرہ نے کئی اسباب کی بنا پر احرار سے پہلوتہی کی لیکن بالآخر ذمہ دار حکومت کے اسی مطالبہ پر پہنچے جس سے بارہ برس پہلے انہیں اس لئے بھی اختلاف تھا کہ اس کے مجوز احرار تھے۔

۴۔ اس تحریک نے ملک کی تمام ریاستوں کے استبدادی نظام کو ذہنی طور پر ہلا ڈالا۔ جس سے زمانہ شناس حکمرانوں نے مستقبل کے رجحانات کا واضح طور پر اندازہ کر لیا ریاستی باشندوں میں سیاسی شعور نے راہ پائی مزید برآں ان میں عزت نفس کا احساس پیدا ہو گیا۔

۵۔ قادیانی جماعت کے سیاسی خدوخال کی صحیح وضاحت کا پہلی دفعہ سنگ بنیاد رکھا گیا۔

۶۔ عام مسلمانوں میں اس ذہن کو نشوونما حاصل ہونے لگا کہ طبقاتی شعور ہی سرمایہ دار معاشرے کے بنیادی روگوں کا صحیح علاج ہے۔

دوسرا رخ یہ تھا۔

۱۔ حکام ریاست نے پہلے تو احرار کو نظر انداز کیا پھر ترغیب و تحریص کا دام پھیلایا جب یہ دونوں حربے ناکام ہو گئے تو اندرون ریاست کے راہنماؤں سے سمجھوتہ کر کے سازشی حملہ شروع کر دیا۔

۱۔ ریاستی راہنماؤں کو نہ صرف احرار کی ہمنوائی سے روک دیا بلکہ ان سے کنارہ کشی کا اعلان کرا ڈالا۔

ب۔ ریاست سے باہر پوری ہندو قوم کو بلا تفریق عقیدہ و خیال مخالف بنا دیا حتیٰ کہ مہاتما گاندھی نے بھی گول میز کانفرنس (لندن) میں کہہ دیا کہ تحریک کشمیر سے انگریزوں کو تقویت پہنچنے کا امکان ہے۔

ج۔ مسلمانوں کے ان عناصر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی جو احرار کی سیاسی ساکھ سے خار کھاتے تھے اور جنہیں احرار کا یہ عروج گوارا نہ تھا۔

۲۔ انگریزوں کا منشا شروع میں کچھ اور تھا جس طرح تحریک خلافت کے فوراً بعد ہندو مسلم اتحاد کو غتر بود کرنے کے لئے ہندو مسلم فسادات کا تخم بو دیا گیا تھا۔ اسی طرح وہ اب ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کے میثاقی خاتمہ پر چاہتے تھے کہ:

۱۔ جن چند ہزار (کانگرس کی رپورٹ کے مطابق چودہ ہزار) مسلمانوں نے تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا ہے وہ بھی اپنے آپ کو آئندہ کے لئے منقطع کر لیں یا ان کا رسوخ ضائع ہو جائے۔

ب۔ سرحد میں سرخ پوشوں کی نئی طاقت کا فروغ انگریزوں کے لئے سوہان روح تھا وہ قصہ خوانی بازار کے واقعہ ہائلہ سے نہ صرف مرعوب تھے بلکہ ایک سرحدی صوبہ میں اس صورت حالات سے خائف بھی تھے ان کے نزدیک اس کا تدارک دو قومی نظریہ کے تصادم و تکرار ہی سے ہو سکتا تھا۔

ج۔ انہی دنوں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ہو رہی تھی، گاندھی جی کو اصرار تھا کہ وہ تمام ہندوستان کے نمائندے ہیں ادھر مسلمان نمائندے ان کے اس دعویٰ کی تغلیط کے لئے موجود تھے۔ چنانچہ کشمیر کے قضیہ نے ہندو مسلم مغایرت کا واضح ثبوت مہیا کر دیا تھا۔

۳۔ ان اغراض کو ملحوظ رکھتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے کوشش کی کہ وہ اپنے

فرستادہ لوگوں کی معرفت کام لے چنانچہ ان عناصر نے لیپا پوتی کر کے علامہ اقبالؒ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی ، برطانوی سیاست کا سب سے کامیاب مہرہ میرزا محمود احمد صدر بن بیٹھا لیکن احرار مزاحم ہو گئے ، انہیں اپنی علیحدہ جماعتی زندگی کی نیو اٹھانے کے لئے سیاسی میدان چاہیئے تھا جو قدرت نے مہیا کر دیا۔ علامہ اقبال نے میرزا محمود احمد اور ان کی امت کے ہتھکنڈوں کو محسوس کرتے ہوئے احرار کی استدعا پر کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ امراء اٹھے اور چھا گئے۔ انگریزوں نے بوجوہ چپ سادھ لی ، امراء اشارہ پاتے ہی معاون بن بیٹھے، احرار نے غنیمت سمجھا اور ان سے دامے سخنے فائدہ اٹھایا لیکن تنظیم سے الگ رکھا۔ آخر ریاست نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے ، وائسرائے نے آرڈی ننس نافذ کر دیا جس سے تحریک کا رخ بدل گیا۔ امراء واپس ہو گئے ، صورت حالات کا نقشہ اس طرح ہو گیا کہ :

ا ۔ انگریز چالیس پینتالیس ہزار افراد کی رضاکارانہ اسیری کو مسلمانوں میں ایک ایسے ذہن کا نمو سمجھنے لگا جس کا اس سے پہلے اُسے اندازہ نہ تھا اور پنجاب میں تو اُسے مطلق یہ گوارا ہی نہ تھا۔

ب ۔ مسلمان امراء کو یہ طبعاً ناپسند تھا کہ اپنی گدیاں ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جنہیں وہ ازراہ تعریض کنگلے کہتے آئے تھے۔

ج ۔ خود مسلمان امراء نے آج تک یہ گوارا ہی نہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں ایسی کسی عوامی تحریک کو ابھرنے دیں جس کی باگ ڈور غرباء کے ہاتھ میں ہو یا اُن کا رسوخ بڑھے۔

د ۔ نواب اسماعیل میرٹھی کی معرفت وائسرائے نے چودھری افضل حق سے ملنا چاہا تو ان امراء نے احتجاج کیا کہ آپ فروتر لوگوں سے مل کر اپنے مرتبہ کو گھٹانے کی غلطی نہ کیجیے۔

ہ ۔ قادیانی جماعت کے لئے بدلہ چکانے کا یہ بہترین موقع تھا نتیجہ یہ نکلا کہ احرار کو اس سارے قضیہ میں اتنی بڑی قربانی کے باوجود شکست فاش ہوئی ریاست نے ہتھیار ڈال کر ہتھیار اٹھا لیئے ، انگریزوں نے احرار کو مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مسلمان امراء نہ صرف

اُلٹے پاؤں بھاگ گئے بلکہ اس سوچ میں لگ گئے کہ احرار نے پنجاب میں جو اثر پیدا کیا ہے اس کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے، ہندو شروع سے بیزار تھے ملک کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم کانگرس نے احرار کو نافرمان سمجھ کر سیاسی اچھوت سمجھا۔ کئی مسلمان راہنما جو کبھی احرار کے ہم خیال یا ہم سفر رہے تھے احرار کی مقبولیت کو اپنی الگ شخصیتوں کے لئے مضر سمجھتے اور چاہتے تھے کہ احرار بہر صورت ختم ہو جائیں، غرض احرار خطرناک قسم کے سیاسی نرغے میں تھے۔

تحریک کپورتھلہ

احرار کا دوسرا عوامی محاذ ریاست کپورتھلہ کی کسان تحریک (۱۹۳۳ء) تھا۔ ریاست نے خود مسلمان امرا کی معرفت اس تحریک کا گلا گھونٹ دیا وہاں وزیر اعظم مسلمان تھا اس نے ایک ہوشیار شاطر کی طرح صف آرا قوتوں کو چاروں شانے چت کیا۔ مگر احرار ہر حال میں ایک سیاسی طاقت بن چکے تھے ایکا ایکی شہید گنج کے انہدام نے اس طاقت کو اس بُری طرح برباد کیا کہ پھر وہ سنبھالے تو لیتے رہے لیکن سنبھل نہ سکے۔ جس تیزی سے اُبھرے تھے اُسی سرعت سے پسپا ہو گئے۔

کمیونل ایوارڈ

اواخر ۱۹۳۲ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو گاندھی جی جیل میں تھے۔ اس ایوارڈ میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رکھا گیا، گاندھی جی نے اس علیحدگی کے خلاف مرن برت شروع کیا۔ گورنمنٹ نے گھبرا کر انہیں چھوڑ دیا۔ اس پر اچھوت راہنماؤں اور ان کے مابین "پونا پیکٹ" ہو گیا جو ریمزے میکڈانلڈ نے تسلیم کر لیا۔ اِدھر اس ایوارڈ میں مسلمانوں کو ان کے اکثریتی صوبوں میں پچاس فیصد سے ایک یا دو نشستیں زائد دی گئی تھیں۔ پنجاب کے ہندوؤں نے متحد ہو کر چلّانا شروع کیا کہ اسلام راج قائم کر دیا گیا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ گورو دوارہ تحریک کی کامیابی سے کچھ زیادہ ہی منچلے ہو گئے تھے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اعلان جڑ دیا کہ کمیونل ایوارڈ میں مسلمان راج کے جراثیم ہیں۔ اگر اسے بدلا نہ گیا تو سکھ خون کی ندیاں

بہا دیں گے۔ ماسٹر جی نے سکھوں کو گورو گرنتھ پر حلف لینے کی تلقین کی ہر کہیں یہ حلف اُٹھایا گیا ——— شاہ جی انہی دنوں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ ماسٹر جی کی دھمکیاں پڑھیں تو امرتسر کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ماسٹر جی ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے ڈرائیں نہیں، غالباً وہ اس سے بے خبر ہیں کہ ہم خون کے قلزموں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں"۔

شاہ جی کمر بستہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے انہیں تحریک کشمیر کے تجربے میں ہندوؤں اور سکھوں کے اجتماعی ذہن نے پہلے ہی آزردہ کر رکھا تھا ایک ایک شہر اور ایک ایک قصبہ کا چکر کاٹا۔ تمام صوبے میں شاہ جی کی شعلہ نوائی نے سحر کا کام کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ منقار زیر پر ہو گئے اور دوبارہ یہ لب ولہجہ کبھی استعمال نہ کیا۔

میرزائیت کا تعاقب

احرار کا دوسرا بڑا محاذ میرزائیت کے خلاف تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی حکومت کی ایک خود کاشتہ طاقت کو ایک ایسی بے ڈھب جماعت سے واسطہ پڑا جس نے نہ صرف مسلمانوں میں اس کی تبلیغی طاقت زائل کر دی بلکہ اس کے برطانوی چہرے سے نقاب اُلٹ دی اس مہم کی تائید میں بعض مؤثر آوازیں اُٹھیں۔ علامہ اقبال نے میرزائیت کو کھلم کھلا مسلمانوں سے الگ ایک مذہب اور فرقہ قرار دیا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جناب میرزا سر ظفر علی نے بھی میرزائیت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ حیدر آباد کے ایک فاضل مولف جناب الیاس برنی نے "قادیانی مذہب" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں میرزا غلام احمد سے لے کر میرزا محمود احمد تک کی تحریروں سے ان کے مبادی و مقاصد، مطالب و عزائم اور رجحانات و میلانات کا کچا چٹھا پیش کیا ——— اس پر مسلمانوں کی بعض تعلیمی انجمنوں کو فیصلہ کرنا پڑا کہ میرزائی ان کے اداروں کے رکن نہیں ہو سکتے۔ اس صورت حالات سے میرزائیت اور اس کے اعوان و انصار گھبرا گئے۔ میرزا محمود احمد پیٹھ پیچھے خنجر بھونکنے میں یگانہ تھے انہوں نے خنجر کو آستین میں رکھا

اور گھات میں بیٹھ گئے۔ اِدھر پنجاب کے اُمراء کا طبقہ جن کی خصوصیتیں اُوپر بیان ہو چکی ہیں احرار کی تیز روی اور قبول عامہ کو اپنے لئے مضر سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے آئندہ کے الیکشن تھے ملک کو پہلی بار صوبائی خود مختاری حاصل ہو رہی تھی۔ مسلمانوں اور نامسلمانوں کی طاقت میں دو یا تین ووٹوں کا فرق تھا۔ اُمراء نہیں چاہتے تھے کہ اس فرق سے فائدہ اُٹھا کر احرار آگے بڑھیں اور اختیارات پر قابض ہو جائیں۔ خود انگریز اس معاملہ میں چوکنا تھا۔ پنجاب بہرحال اس کا قلعہ تھا اور برطانوی اقتدار کو اس کے خود کاشتہ اُمراء ہی تحفظ دے سکتے تھے۔

احرار اس سے غافل الذہن نہ تھے ان کے پیش نظر بھی انتخابات تھے اور سمجھتے تھے کہ طاقت کے بغیر کوئی تنظیم بھی مؤثر نہیں ہوتی ——— عجب نہ تھا کہ وہ شہری اور قصباتی نشستوں میں سے بیس پچیس نشستیں بہ آسانی حاصل کر لیتے لیکن میاں سر فضل حسین مرحوم انہیں شہ مات دینے میں کامیاب ہو گئے۔ گو وزارت عظمیٰ کا خواب میاں صاحب کی ناگہانی موت سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن مرنے سے پہلے وہ احرار کو شکست دے گئے۔ سردار سکندر حیات نے ان کی جگہ لی۔ پہلے تو احرار رہنماؤں سے دوستی گانٹھتے رہے تھے لیکن میاں صاحب کا جانشین ہوتے ہی طوطا چشم ہو گئے اور احرار کو فنا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس کی تفصیلات اس کتاب کا حصہ نہیں ہیں۔

شہید گنج کا قضیہ

شہید گنج کا قضیہ نامرضیہ اس ساری داستان کا ایک فراموش شدہ مگر عبرت ناک باب ہے، شہید گنج پر ایک زمانہ سے سکھوں کا قبضہ تھا اور وہ کسی صورت میں بھی اسے مسجد تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بلکہ گوردوارہ شہید گنج کا ایک حصہ سمجھتے تھے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میر منو گورنر پنجاب نے بعض سکھوں کو یہاں قتل کرایا تھا اور یہ ان کے مقتولین کی جگہ ہے۔ جب اکالی تحریک کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا اور اس ایکٹ کے بنانے میں میاں فضل حسین مرحوم و مغفور نے بھی اعانت کی تو شہید گنج کی ملکیت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی

جن میں سردار سکندر حیات کے عمزاد نواب مظفر خان بھی شریک تھے۔ نواب صاحب نے سکھوں کی ملکیت تسلیم کر لی۔ مسلمانوں نے ایک دو بار چارہ جوئی کی مگر ناکام رہے ـــــ ان فیصلوں اور اپنے قبضے کے باوجود سکھوں نے انہدام مسجد سے احتراز کیا۔ اب کئی سال بعد آغاز جولائی ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی مسجد گرائی جانے لگی تو مسلمان چونک اُٹھے۔ ہر طرف شور مچ گیا حتیٰ کہ دیکھتی آنکھوں شعلہ جوالہ بھڑک اُٹھا۔ اس بارے میں اب کوئی راز نہیں رہا کہ :

"شہید گنج لاہور میں ہے اور لاہور پاکستان میں ہے! جن لوگوں نے اس وقت شہید گنج کی بازیابی کے لئے ڈرامہ کھیلا تھا ان میں ننانوے فی صد بقید حیات ہیں لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے کامل انخلا کے باوجود شہید گنج پر پولیس کا سنتری پہرہ دیتا ہے، کسی کو اس کے مسجد ہونے کا خیال نہیں رہا اور نہ کسی طرف سے کوئی آواز اُٹھتی ہے جہاں تک حکومت کے مصالح و مقاصد کا تعلق ہے وہ معلوم ہیں لیکن سوال ان لوگوں کا ہے جو اس وقت شہید گنج کی بازیابی کے نام پر سیاسی ناٹک کھیل رہے تھے۔"

بہرحال ان اسرار سربستہ کا خلاصہ یہ ہے کہ :

۱۔ مسجد حکومت کے ایما اور سر ہربرٹ ایمرسن گورنر پنجاب کی شہ پر گرائی گئی۔ حکومت نے کرین مہیا کیا۔ جس شخص نے سب سے پہلے مسجد کے گنبد پر کدال چلائی وہ پنجاب سی آئی ڈی کا ایک سکھ سب انسپکٹر پولیس تھا۔ اس کی رپورٹ کا خلاصہ ایک مسلمان انسپکٹر پولیس کی معرفت مولانا ظفر علی خاں کے پاس پہنچا۔ وہاں سے راقم الحروف کے ہاتھ لگا۔

۲۔ دو سوشلسٹ نوجوان اس الزام میں ماخوذ تھے کہ انہوں نے شہید گنج کے انہدام کا ذمہ دار حکومت کو گردانا تھا۔ ان کے خلاف ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے راقم الحروف کو صفائی میں طلب کیا، راقم نے عدالت میں ذاتی معلومات کا سوال اُٹھایا۔ عدالت نے حکام بالا سے مشورہ کیا۔ حکومت کے کارندوں کا ضمیر اس معاملہ میں مجرم تھا انہوں نے انکار کر دیا۔ شہادت نہ ہو سکی مگر یہ بات اپنی جگہ موجود

ہے کہ انہدام مسجد میں اس وقت کے انگریز گورنر اور صوبائی بیوروکریسی کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

۲۔ سکھوں میں داخلی طور پر دو دھڑے تھے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا گوردوارہ پربندھک کمیٹی پر قبضہ تھا جو لوگ اندر خانے ان کے دھڑے کو شکست دینا چاہتے اور آئندہ انتخابات میں اپنی کامیابی کے لئے پر تول رہے تھے۔ انہوں نے سرکاری سازش میں شریک ہو کر مسجد کے انہدام کا فیصلہ کیا۔ ماسٹر تارا سنگھ کو اس وقت خبر ہوئی جب مسجد گرنے لگی۔ انہوں نے مولانا داؤد غزنوی سے صورت حالات سمجھنے کے بعد سردار منگل سنگھ کو لاہور بھیجا کہ مسجد گرانے والوں کو روکیں۔ مگر حکام نے انہیں لنڈے بازار کے نکڑ پر روک لیا تاآنکہ مسجد ہموار ہو گئی۔ اب کوئی سکھ لیڈر بھی انہدام مسجد کی مذمت کر کے سکھ قوم میں اپنی شہرت کھونے کو تیار نہ تھا۔ سب اکھٹے ہو گئے اس کا فائدہ یونینسٹ پارٹی کے دست و بازو سر سندر سنگھ مجیٹھیا کو بھی پہنچا وہ اپنے بعض ساتھیوں سمیت انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ غرض پنجاب میں وزارت بنوانے کا جو نقشہ انگریزوں کے ذہن میں تھا وہ ان کی مرضی و منشا کے مطابق بن گیا۔

۳۔ سر میاں فضل حسین ہندوستان میں مسلمانوں کی جاگیردارانہ سیاست کے سب سے بڑے شاطر تھے۔ احرار نے سر ظفر اللہ خان کی مرکز میں نامزدگی پر میاں صاحب کو ہدف مطاعن بنا کر اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ تمام خاندانی کاسہ لیس جو احرار کے قبول عامہ سے خائف ہو کر ان کے گرد جمع تھے شہید گنج کے انہدام پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آن واحد میں مجلس عمل بن گئی۔ ایک بساط پر کئی مہرے جمع ہو گئے۔ جو لوگ مخلص تھے انہیں دھوکے میں رکھا گیا۔ ادھر احرار راہنما لاہور سے باہر تھے ان کی غیر حاضری میں سازش کا اختیاری و غیر اختیاری لائحہ عمل تکمیل پا گیا۔ چال یہ تھی کہ احرار راستہ سے ہٹ جائیں یعنی تحریک میں حصہ لیں تو مارے جائیں نہ حصہ لیں تو پٹ جائیں۔ دونوں صورتوں میں ان کے لئے کربلا کا ایک میدان تھا اور انہیں مٹانے کیلئے متضاد و متباین عناصر اکھٹے ہو گئے تھے۔

ا ۔ احرار کو شروع ہی سے نشانے پر رکھا گیا مسجد کا حصول مؤخر اور احرار پر سب وشتم مقدم ہو گئے ۔

ب ۔ میاں عبدالعزیز بار ایٹ لار کے مکان پر بشمول احرار مختلف حلقہ ہائے خیال کے لوگوں کی جو میٹنگ ہوئی اس میں انہدام مسجد کے خلاف حکم امتناعی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن مولانا اختر علی خان ڈپٹی کمشنر ایس پرتاب اور سٹی مجسٹریٹ سردار ترنید سنگھ کے جھانسے میں آگئے ۔ درخواست تحریری (؟) یا لسانی (؟) جیب میں رکھ چھوڑی ۔ مسجد مسمار ہو گئی ۔

ج ۔ جن مختلف الخیال عناصر نے احتجاج کا بیڑا اٹھایا تھا وہ خرابی حالات کے خوف سے خود تجویز کر کے نظر بند ہو گئے مگر مخلص نوجوانوں کو کئی مہروں کی انگیخت پر گولیوں کا نشانہ بننا پڑا ۔ سب سے بڑی سیاسی ضرب احرار پر پڑی ان کے خلاف مسلسل واویلا شروع ہو گیا ۔ اسی دوران میں ان لوگوں کو بھی صف آرا کیا گیا جو افسروں کے جاسوس اور سرکاری ٹکسال میں ڈھلے ہوئے تھے ۔ حضرت امیر ملت سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارد گرد جن لوگوں کو مامور کیا گیا ان میں سے نوے فیصد حکومت کے کارندے اور پنجاب سی آئی ڈی کے ایک سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین کے آلہ کار و خدمت گزار تھے ۔

د ۔ مجلس اتحاد ملت پر ابتداً ان لوگوں کا عمل دخل رہا جو سی آئی ڈی کے تنخواہ دار مخبر تھے اور حصول شہید گنج کے مقاصد کی بجائے میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ (سی آئی ڈی) اور ایس پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور کی باہمی آویزش کا کھلونا بنے ہوئے تھے ——— مولانا ظفر علی خاں نظر بندی سے رہا ہو کر لاہور تشریف لائے تو مجلس اتحاد ملت کے ڈرامہ کا نیا باب شروع ہو گیا ——— عام انتخابات میں مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی احرار سے اپنا قرض چکانے کے لئے اتحاد ملت کے نقیب بن گئے ۔ ادھر احرار شہید گنج کے ملبے میں بری طرح دب چکے تھے ، چودھری افضل حق جن سے یونینسٹ راہنما خوف کھاتے تھے فرضی شہیدوں کی نمائش سے ہرا دیئے گئے ۔ انتخاب کا پالا یونینسٹوں نے مار لیا ۔ ڈاکٹر عالم شہید گنج

کی اینٹوں کا نام لے کر کامیاب ہو گئے مگر جیتنے کے فوراً بعد کانگرس میں چلے گئے۔ وہاں دال نہ گلی تو لیگ کا رخ کیا۔ ملک خضر حیات اور قائد اعظم میں تصادم ہو گیا تو خضر حیات کا ساتھ دیا آخر ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں ہار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اس انتخاب کے بعد جب احرار کی سیاسی شکست مکمل ہو گئی اور عمومی شہرت کو دھکا لگ چکا تو کسی نے شہید گنج کا نام نہ لیا۔ ملک برکت علی مرحوم نے بازیابی کے لئے مسودہ قرارداد پیش کرنا چاہا لیکن ایک دلچسپ اُفتاد مانع ہو گئی۔

اب احرار نے شہید گنج کے راہنماؤں کو للکارنا شروع کیا، مولانا مظہر علی اظہر نے سول نافرمانی کا ڈول ڈالا۔ خود بھی قید ہو گئے اور کئی سو رضا کاروں کو بھی قید کرا ڈالا۔ مگر بات نہ بنی۔ عوام کے ولولے مدت ہوئی مر چکے تھے، جو لوگ مجلس اتحاد ملت کے لیڈر تھے وہ مختلف افسروں کے ہاتھ میں تھے۔ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ شہید گنج کا حصول نہ اس وقت پیش نظر تھا نہ اب ——— آخر سردار سکندر حیات نے زبان کھولی اور اعلان کیا کہ شہید گنج کا حصول بوجوہ دشوار ہے کیونکہ اس ایک مسجد کے جبری حصول سے مسلمانوں کو وہ تمام معابد لوٹانے ہوں گے جن پر مسلمان بادشاہوں کے عہد میں مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے اس اعلان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا حتیٰ کہ اتحاد ملتی لیڈر بھی آمنا و صدقنا پکار اُٹھے۔

یہ اعلان کوئی نیا نہیں تھا بلکہ مستعار تھا۔ مولانا مظہر علی اظہر نے انہدام مسجد کے وقت جب مسلمان ابھی شہید نہیں ہوئے تھے یہی دلیل دی تھی مگر اس وقت سازشی لیڈر ماننے کو تیار نہ تھے اور سادہ دل عوام غیظ میں تھے۔ اب جانبین نے اپنا پینترا بدل لیا۔ احرار کہتے تھے آؤ مسجد لیں، داعی کہتے تھے سکندر حیات کی بات درست ہے۔

احرار کے لئے آزمائش کا یہ سب سے بڑا دور تھا۔ ایک محدود ذہن کے سوا تقریباً سب لوگ ان سے کٹ چکے تھے۔ تمام احرار راہنماؤں کو ایک شدید یلغار کا سامنا کرنا پڑا

گو رفتہ رفتہ انہوں نے اسٹیج پر قابو پالیا اور اپنی بات بھی کہنے لگے لیکن بہت کچھ کھو کر۔

اصلاً شہید گنج کے معاملہ میں ان سے ایک سیاسی غلطی ہو گئی اگر وہ شروع ہی میں حصہ لے کر اس کا رُخ پلٹتے تو زیادہ مفید نتائج پیدا ہوتے۔ انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا جس سے مار کھا گئے۔

احرار کی اس بربادی کا سب سے زیادہ فائدہ ایک خاص دائرہ میں میرزا البشیر الدین محمود نے اُٹھایا۔ اس نے شروع سے آخر تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ جہاں کہیں اور جس طرح بھی احرار کو ضعف پہنچ سکتا تھا اس نے اس میں رتّی بھر کمی نہ کی۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقدمہ میں میرزا البشیر الدین محمود کے خلاف بھسڑجی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ ایک دولوٹک محاکمہ تھا۔ یہ فیصلہ ۶ جون ۱۹۳۵ء کو سُنایا گیا۔ کوئی ایک ماہ بعد شہید گنج کا سانحہ پیش آگیا، میرزا نے احرار دشمن تقریروں کی پشت پناہی کا بیڑا اُٹھایا، چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس نے اس مہم میں کئی لاکھ روپیہ صرف کیا مگر ایک منفی فائدے کے سوا میرزائیت کو کوئی اثباتی فائدہ نہ پہنچا۔ عام مسلمانوں میں قادیانیت کا وجود ہمیشہ کے لئے مشتبہ ہو گیا، اس کے پیرو مسلمان عوام کے اجتنابی نرغہ میں آگئے، مذہبی اعتبار سے ان کی محرومی دائمی ہو گئی، ان کا تجزیہ و محاسبہ ایک تحریک بن گیا اور یہ سب کچھ احرار کی بالواسطہ و بلاواسطہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ اَب میرزا صاحب اور ان کی مشنری کے اعضاء احرار پر شہید گنج کی مسجد کا ملبہ پھینکنے میں پیش پیش تھے۔

شاہ جی یار و اغیار کی ان نوازشوں سے دل برداشتہ بھی ہوتے اور صورت حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر قلباً یہ رائے قائم کر لی کہ الیکشن بہت بڑا فتنہ ہیں۔ پھر طوعاً و کرہاً الیکشن میں حصہ لیا مگر علی الاعلان فرماتے الیکشن قومی زہر ہیں۔ جماعت کو الیکشن سے باز رکھنے کی ہر دفعہ کوشش کی لیکن جماعت کے "دماغ" اُن کی "زبان" کی پناہ تو لیتے مگر ان کے دماغ سے فائدہ نہ اُٹھاتے نتیجہ معلوم کہ انگریزی عہد کے آخری انتخابات (۱۹۴۷ء) میں

ان کے ساتھیوں نے ان کی بات نہ مان کر جو زک اُٹھائی اس کا خمیازہ اس طرح بھگتنا پڑا کہ ان پر ایک دوسری شہید گنج گر گئی ـــــ حتیٰ کہ ان کے حقیقی کارنامے بھی انتخابات کی پے در پے شکستوں کے گرد و غبار میں دب کر سیاسی کھلنڈروں کے آوارہ قہقہے ہو گئے اور اب ؎

لختے بُرد از دل گزرد ہر کہ ز پشیم
من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

دوسری جنگِ عظیم

ابھی شہید گنج کے زخموں کا کھرنڈ باقی تھا کہ احرار نے برطانوی حکومت کو ضربیں لگانے کا فیصلہ کیا اور آرمی بل کی مخالفت شروع کر دی یہ بل یورپ کے جنگی امکانات کی وجہ سے سنٹرل اسمبلی میں زیر بحث ہی تھا کہ احرار نے رائے عامہ کو اس کے خلاف منظم کرنا شروع کیا اور بمبئی سے لے کر پشاور تک ہنگامہ رچا دیا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے ڈینزگ پر حملہ کر کے دوسری عالمگیر جنگ چھیڑ دی۔ احرار راہنما اسی دن کی راہ دیکھ رہے تھے۔ چودھری افضل حق نے چھ ماہ قبل ۷ اپریل ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا احرار کانفرنس کے صدارتی ایڈریس میں کہا تھا۔

"جنگ قضائے مبرم بن کر مغرب کے سروں پہ کرگس کی طرح منڈلا رہی ہے۔ یہ نازک و مغلوب قوموں کو خبردار ہونے کا اشارہ ہے، برطانوی سرکار میدان جنگ میں پہلا گولہ گرنے سے پیشتر نیاز مندی کا نمونہ بن کر سامنے آئے گی۔ احرار شہنشاہیت کی اس مصیبت کو غلاموں کے لئے رحمت خیال کرتے اور آئندہ جنگ کو ہندوستان و دنیائے اسلام کے لئے حصول آزادی کا بہترین موقع سمجھتے ہیں۔ ہمارا فرض ہوگا کہ ہم اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر برطانوی شہنشاہیت پر ضرب لگائیں"۔

چنانچہ احرار ہائی کمانڈ کا فوری اجلاس ۱۲ ستمبر کو امرتسر میں منعقد ہوا جس میں فوجی بھرتی کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کیا گیا ـــــ لیگ نے اس وقت تک حصول پاکستان کا نصب العین اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے سارے چھ ماہ بعد جب بڑے بڑے احرار زعما

جیل خانوں میں تھے لیگ نے لاہور کے سالانہ سیشن میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اس وقت تک عامۃ المسلمین میں احرار کے جرأت مندانہ اقدام سے ہمدردی کا ذہن عام تھا، گو سول نافرمانی میں وہ اجتماعاً شریک نہ تھے لیکن "آشیرواد" دینے میں پیچھے بھی نہ تھے —— کانگرس نے احرار کے اس فیصلے کو عاجلانہ قرار دیا۔ سوشلسٹوں نے تعاون کی پیش کش کی اور وہ ایک متحدہ محاذ بنانے کے سوال پر گفتگو بھی کرتے رہے لیکن فوری گرفتاریوں سے مشترکہ محاذ کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

احرار کو اپنے اس اقدام کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ مسلمان قرارداد پاکستان کے بعد انہیں بھول گئے۔ کانگرس نے نظر انداز کیا بالخصوص پنجاب کے کانگرسی زعما تو احرار کی بہ نسبت سردار سکندر حیات سے زیادہ قریب تھے۔ انگریزوں نے اپنے گماشتوں کی معرفت احرار کو طویل سے طویل سزائیں دے کر بزعم خویش خوار کیا۔ جیلوں میں احرار قیدیوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بدتر سلوک ہوتا رہا۔ گوجرانوالہ کے ایک ہندو مجسٹریٹ نے احرار کے ایک نوجوان کو سزا دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں لکھا کہ احرار سے اخلاقی قیدیوں جیسا سلوک کیا جائے۔ اس پر بڑے بڑے دیش بھگت منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ ایک موقع پر راستے بہادر مہر چند کھنہ نے جو آگے چل کر خان وزارت میں وزیر مالیات ہو گئے: گاندھی سے یہ بیان حاصل کیا کہ احرار کلہاڑی رکھتے ہیں جو تشدد کا نشان ہے، لہٰذا ان کا کانگرس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بیان کی آڑ میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ایسے مہاپرشوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

المختصر احرار نے اس معرکہ میں سخت سے سخت اذیتیں سہیں، ہر استبداد کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ حتیٰ کہ موت وحیات کے درمیان کوئی راہ باقی نہ رہی۔ چودھری افضل حق جان لیوا مرض میں مبتلا ہو کر رہا ہوئے اور چند مہینوں ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا محمد گل شیر، صوفی عنایت محمد پسروری، احسن عثمانی، حکیم غوث محمد یامپوری

اور راقم الحروف دو برس تک قید تنہائی میں رکھے گئے، تمام عرصہ چکی پیسنے کو دی گئی۔ حکیم صاحب سی کلاس کی خوراک سے دمہ کے دائمی مریض ہو گئے۔ احسن عثمانی نے بھوک ہڑتال کی تو اس کی مقعد میں نالی گھسیڑ کر اسے نڈھال کر دیا گیا۔ آخر اس داخلی صدمہ کی تاب نہ لا کر وہ رہا ہوتے ہی موت کے منہ میں چلے گئے۔ راقم الحروف سے جو سلوک ہوتا رہا اس کی بہیمیت کا تذکرہ "پس دیوار زنداں" میں آگیا ہے جو راقم کے ایام اسیری کی سرگزشت ہے۔

چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کا سیاسی رُخ یکسر پلٹ گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۲ء میں کانگرس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی تو احرار نے حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ احرار نہ کانگرس کے رہے نہ لیگ کے، دونو کی ہمسفری و ہم نوائی سے گریز کیا پھر جب حکومت الٰہیہ کا ریزولیوشن پاس ہوا تو اس وقت کئی احرار راہنما جیل میں تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو احرار کے ہمیشہ سے صدر چلے آتے تھے ایک بے میعاد زمانہ نظر بندی دھرم سالہ جیل میں گزار رہے تھے۔

دراصل یہ احرار کے ایک ایسے ذہن کا اندازِ فکر تھا جو اینٹی برٹش ہونے کے باوجود کانگرس سے ہم آہنگ نہ تھا۔

جنگ ختم ہو گئی، اتحادیوں کو فتح ہوئی لیکن جن لوگوں کو ظالمانہ حد تک انگریز دشمن سمجھا جاتا تھا وہ ایک بڑا حصہ پابند اور زبان بند ہی رہے۔ خود راقم الحروف اتحادیوں کی فتح کے ایک سال بعد تک نظر بند رہا۔

مولانا محمد گل شیر کی شہادت

انہی دنوں احرار کو ایک اور وار سہنا پڑا۔ مولانا محمد گل شیر اپنے گاؤں جنڈ ضلع کیمبل پور میں رات کے وقت سوتے میں گولی مار کر شہید کر دیئے گئے۔ ان کے قاتلوں کا سراغ کبھی نہ ملا۔ بہرحال ان کا قتل ایک سیاسی قتل تھا اور اس کے پس منظر میں وہ تمام رجحانات و میلانات تھے جن کا ذکر پنجاب کی خصوصیتوں کے ابتدائی ذکر میں آچکا ہے ——— مولانا جب تک

کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ تھے اور صرف واعظ تھے اس وقت تک کیمبل پور، اٹک اور میانوالی وغیرہ میں بڑے لوگوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ وہ مدتوں احرار کی مخالفت کرتے رہے۔ جب کوئی احرار لیڈر ان علاقوں میں جاتا اس سے اگلے ہی دن اس کا اثر زائل کرنے وہاں پہنچ جاتے ـــــ آواز میں بلا کا سوز اور خطابت میں ایک طرح کا سحر تھا ٹھیٹھ پنجابی اس آواز پر مرتے تھے۔ ان اضلاع کے عوام میں ان کا خاصہ اثر تھا۔

۱۹۳۸ء میں حج کو گئے تو وہاں مدینہ منورہ میں خواب دیکھا۔ حضورؐ فرماتے ہیں احرار سے مل کر خدمت خلق کرو۔ مولانا فرماتے تھے میں نے اپنی پچھلی مخالفتوں سے توبہ کی اور آتے ہی احرار میں شمول کا اعلان کر دیا۔ کوئی ایک سال بعد احرار نے فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک چلائی تو آپ بھی دو سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ قید کا زمانہ انتہائی شجاعت اور غیرت سے بسر کیا۔ معلوم ہوتا قرن اوّل کا کوئی صحابی راہِ خدا میں صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔ اُدھر علاقے کے خانوں کو آپ کا احرار میں شمول ناپسند تھا۔ اِدھر آپ نے ان کے علاقوں میں احرار کی شاخیں قائم کرنا شروع کر رکھی تھیں۔ ایک دو جگہ کسانوں اور خانوں میں مڈبھیڑ بھی ہوئی۔ جن خوانین نے لوگوں کو شاہ جی کی میزبانی سے روک دیا تھا وہ بھلا مولانا محمد گل شیر کے اس قبولِ عامہ اور دعوتِ احرار کیونکر برداشت کرتے ـــــ مولانا چند مہینوں ہی میں قتل کرا دیئے گئے۔ ملک خضر حیات نے بہ طور وزیر اعلیٰ قاتلوں کی تلاش کے کئی وعدے کئے لیکن سب دوشیزاؤں کی کہہ مکرنیاں ثابت ہوئے۔ یا پھر پولیس افسروں کے ہلکے تبسم میں گم ہو گئے کہ ان مسکراہٹوں میں سازشوں کی تہ بہ تہ کڑواہٹیں چھپی ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کی موت

چودھری افضل حق کی رحلت کے بعد احرار کے سیاسی فیصلے تضاد و تغلیط کا شکار ہونے لگے۔ اوّل تو احرار نے کتابی نظریوں کو فوقیت دی۔ دوم ان کا اینٹی برٹش ذہن اتنا پختہ تھا کہ وہ سرتاپا جذباتی ہو چکے تھے۔ انہیں اس امر کا اندازہ ہی نہ تھا کہ سیاسیات میں حالات و واقعات

کی رفتار دیکھ کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں وہ دل سے سوچنے کے عادی تھے ان کا جذبہ رفتہ رفتہ ضد بن چکا تھا اور اس ضد کو پروان چڑھانے میں بعض ایسے کوتاہ کار عناصر کی ایک خاص روش کا ہاتھ بھی تھا جو قربانی و ایثار، جذبہ و اعتقاد اور ایمان و اخلاص میں تو ان سے کوسوں پیچھے تھے لیکن اثر و رسوخ، دولت و ثروت اور جاہ و منصب میں منزلوں آگے تھے۔

ماضی مرحوم

احرار ۱۹۴۶ء میں بھی ۱۹۲۰ء (تحریک خلافت) کے زمانے میں گھوم رہے تھے۔ حالانکہ زمانہ چھبیس برس آگے نکل چکا اور دو قومی نظریہ پیدا ہو کر جوان ہو گیا تھا۔ ان کا اعتقاد ہنوز نظری سیاست پر [illegible] مسلمان عملی سیاست میں ڈوب چکے تھے۔ انہیں تاریخ کے اس عمل سے کوئی [illegible] نہ تھا۔ کہ قوموں اور ملکوں کی سیاسیات میں خاص قسم کے معاشی حالات بھی حصہ دار ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ مسلمان اعتقادات کی باتیں تو ان سے سن کر خوش ہوتے لیکن معاملات کے وقت ان کا رُخ ان لوگوں کی طرف ہوتا جو ان کے حقوق و مراعات کا نام لیتے اور ہمسایہ قوم کی مسلمان آزادی کا ذکر چھیڑتے تھے۔ انگریز اسلام اور ملک دونوں کا دشمن تھا لیکن مسلمانوں کے ہاتھ اتنے بلند نہ تھے کہ وہ اس کی آستین سے دشنہ و خنجر نکال لیں۔ ان کی نگاہیں روزمرہ کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھ کر خشمگین ہوتی تھیں جن کا سرچشمہ ہمسایہ قوم کے لوگ تھے۔

احرار اور لیگ

احرار کو غیر شعوری زعم تھا کہ وہ صورتاً یا سیرتاً اسلام سے قریب ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن میں اس کے اثرات بھی تھے، لیکن لیگ کے راہنما مسلمان عوام کی روزمرہ کی زندگی میں گھس چکے تھے اور ان کی طبعی خواہشات کو متشکل کر کے اس کا نام پاکستان رکھ دیا تھا۔ پاکستان ابتداً ہندوؤں سے مسلمانوں کی اجتماعی ناراضگی کا اظہار تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے اسلامی لیکن مادی تقاضوں کا مظہر ہو گیا۔ احرار پاکستان کے مجوزین کی طبقاتی سیرت اور سیاسی کردار کو زیر بحث

لاکر اپنے جائز خدشات کا منفی طریق سے اظہار کرتے تھے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ مسلمان عوام کیا چاہتے ہیں وہ صرف اس سے بحث کرتے تھے کہ جن کی معرفت چاہتے ہیں وہ کون ہیں؛ چودھری افضل حق مرحوم نے انہیں آخری ایام زندگی میں متنبہ بھی کیا تھا کہ پاکستان کی مخالفت نہ کرنا دکھی دلوں کی فریاد ہے لیکن ان کی جذباتی سیاست نے اپنے ہی قائد کی بات کو آویزہ گوش بنانے سے گریز کیا۔

وجہ مغائرت

ضدیوں پیدا ہوئی کہ لیگ کے دولت مند اکابر ان کی غریبی پر طعن توڑتے اور انہیں ہندوؤں کا زر خرید کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک سچا دل گالیوں کی اجتماعی یلغار سے بگڑے گا۔ پھر یہ بگاڑ اس صورت میں اور بھی مضبوط ہوتا ہے جب گالی دینے والا خود گالی ہو اور الزام لگانے والا فی نفسہٖ الزام ہو۔ احرار نے کس مپرسی، غصے جھنجھلاہٹ اور ضد میں پاکستان کے ملی موقف کی اہمیت کو نظر انداز کر کے نہ صرف لیگ کے رہنماؤں سے محاذ جنگ قائم کر لیا بلکہ اس وقت انتخاب میں کود پڑے۔ جب قومی مستقبل کے سوال پر محض انتخاب ہی نہیں استصواب ہو رہا تھا۔

۱۹۴۶ء کے انتخاب میں حصہ لینا احرار کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بعض اجنبائے جماعت نے ضد میں آکر یونینسٹوں کا ہاتھ بٹایا۔ جس سے احرار کے اجتماعی وقار کو سخت دھکا لگا لیکن اس میں عام احرار یا اکابر احرار کا کوئی حصہ نہ تھا۔ چودھری صاحب کی موت کے بعد احرار کے قائد مولانا مظہر علی اظہر تھے جن کا انفرادی ذہن احرار کا جماعتی ذہن سمجھا جاتا تھا —— چونکہ احرار راہنماؤں میں سیاسی اصولوں کے بجائے ذاتی دوستیوں کا میلان ہی غالب رہا اس لئے ایک کی بات پر سب طوعاً یا کرہاً سر جھکا دیتے تھے —— شاہ جی "انتخابی یدھ" میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے جب جماعت کا فیصلہ ہوا اور مولانا مظہر علی اظہر نے پہلی انتخابی تقریر کی تو شاہ جی سری نگر میں تھے۔ مولانا کی تقریر کے ایک ماہ بعد لاہور

تشریف لائے تو نہ صرف انتخاب لڑنے کے فیصلے پر ناراض ہوئے بلکہ مولانا مظہر علی اظہر سے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ "آپ نے سیاسیات میں ذاتیات کو لاکر ایک بُری مثال قائم کی ہے، براہِ کرم آئندہ اس موضوع سے پرہیز کیجئے"۔۔۔۔ اب یہ کوشش کی گئی کہ شاہ جی بھی انتخابی مہم میں حصہ لیں۔ شاہ جی نے یونینسٹوں پر تو تبرا بھیجا لیکن اتنا بہ منت راضی ہوگئے کہ صرف آزمودہ احرار امیدواروں ہی کے حلقہ ہائے انتخاب میں جائیں گے۔ اس زمانے میں آپ نے جو تقریریں کیں اس میں مستقبل کے خدشات بالتفصیل بیان کئے لیکن رنگینی و شیرینی کا وہ انداز ناپید ہی رہا جو زبان و دل کے متحد ہونے سے پیدا ہوتا ہے ؎

ہزار خوف ہوں لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

انتخاب میں احرار کو متوقع شکست ہوئی ان کا ایک امیدوار بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو بعض ناگفتہ بہ حقائق کا پتہ چلا تو سخت دل برداشتہ ہوئے بلکہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ادھر وزارتی مشن ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ احرار رہنماؤں کا وہ قبیلہ جس کی دوستی قابلِ رشک سمجھی جاتی تھی اپنے اندرونی اختلافات کے باعث بٹنے اور بکھرنے لگا۔

مولانا ظفر علی خاں اور غازی عبدالرحمٰن ۱۹۳۱ء ہی میں الگ ہو گئے تھے، وہ صرف نیو اُٹھانے میں شریک ہوئے تھے اور بس، تحریک شہید گنج کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بھی ذہنی علیحدگی اختیار کر لی اور ۱۹۴۰ء کے وسط میں کانگرس میں چلے گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے رہا ہوتے ہی شملہ کانفرنس کے موقع پر اعلان کر دیا کہ ان کے لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ احرار سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد انہوں نے دہلی میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی اور بھارتی شہری ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۹۴۷ء کے شروع میں احرار سے استعفیٰ دے دیا اور

انفرادی طور پر پاکستان کی حمایت کرنے لگے۔ پاکستان بنا تو شاہ جی نے جماعت کے نام ایک خط لکھا کہ احرار کو اپنی سیاسی حیثیت ختم کر دینی چاہیئے۔ کچھ دنوں بعد احرار کا ایک الیا گروہ لیگ کی طرف راجع ہونے لگا جس میں سیاسی شکست خوردگی کا احساس نمایاں تھا۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ایک کھلی کانفرنس منعقد کر کے احرار نے لیگ میں ادغام کا اعلان کیا اور جماعت تبلیغی بنا دی۔ اس تبلیغی تنظیم نے قادیانیت کی سرکوبی شروع کی۔ رفتہ رفتہ پاکستان کے سبھی علماء ہم نوا ہو گئے، اس ہمنوائی نے قادیانیت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کی صورت پیدا کی، فروری ۱۹۵۳ء میں "راست اقدام" کی آگ بھڑک اٹھی، حکومت کو لاہور میں مارشل لاء نافذ کرنا پڑا ——— اواخر دسمبر ۱۹۵۲ء میں حکومت پنجاب نے مجلسِ احرار کو خلافِ قانون قرار دے کر سامان وغیرہ پر قبضہ کر لیا دفاتر سربمہر کر دیئے، کئی سال بعد نواب مظفر علی قزلباش ون یونٹ کے وزیر اعلیٰ ہوئے تو انہوں نے ۱۸ اگست ۱۹۵۸ء کو یہ پابندی ختم کر دی۔ لیکن احرار میں جو لوگ مذہبی اور دینی مزاج و طبیعت رکھتے تھے انہوں نے شاہ جی کی قیادت میں مجلسِ تحفظ ختم نبوت کی بنا ڈالی اور قادیانیت کے خلاف سرگرم ہو گئے جن کے پیش نظر شروع ہی سے امور سیاست تھے۔ وہ عوامی لیگ میں چلے گئے لیکن بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا چوم کے چھوڑ دیا۔ ادھر خلاف قانون ہو کر بھی احراری ذہن علیٰ حالہ قائم رہا۔ پنجاب کے شہروں میں نہ صرف اس کے مضبوط حلقے تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی ان میں ایسا استحکام اور انضباط تھا جس نے حوادث و افکار کی طویل گردشوں کے لیے ایک قبیلوی عصبیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا ———

مندرجہ بالا تصریحات کا تجزیاتی خلاصہ یہ ہے۔

خلاصۂ احرار

۱۔ احرار پنجاب کے ادنیٰ متوسط طبقے کے شہریوں کی ایک ایسی تحریک تھے جس میں جوش و جذبہ وافر تھا۔ وہ لیگ کے ہمہ گیر سیاسی ذہن اور کانگرس کی ہمہ گیر تنظیم کے مقابلہ میں سیاسیات و مذہبیات کے ترکیبی عناصر کا ایک جانثار اور جان نثار مجموعہ تھے ان میں وسعت اور تنوع

نہ تھا وہ زیادہ تر پنجاب تک محدود تھے اور ان کے پیروکار عموماً ادنیٰ درمیانے درجہ کے شہری لوگ تھے۔

۲۔ ان میں سیاست کی یک رنگی کے بجائے رفاقت کی ہم رنگی کا جذبہ کارفرما تھا۔

۳۔ داخلی طور پر ان میں خیالات کا ٹکراؤ بھی تھا لیکن اینٹی برٹش ذہن کی مشترک چھاپ نے انہیں متحد کر رکھا تھا۔

۴۔ جن طاقتوں کے خلاف صف آرا تھے ان کی مختلف الاصل جارحیت کے خلاف مذہبی زبان میں سیاسی اثر پیدا کرتے تھے۔

۵۔ مسلم لیگ کے فروغ سے پہلے اور خلافت کمیٹی کی رحلت کے بعد ہندوستان کے شمال مغربی مسلمانوں میں مضبوط ترین عوامی جماعت تھے اُن کا واحد پروگرام انگریزی حکومت کا خاتمہ تھا۔

۶۔ ان کا جماعتی وجود کانگرس اور جمعیت العلماء کی منشا کے خلاف تھا اور یہ دونو جماعتیں احرار سے کسی حال میں بھی متفق نہ تھیں، مگر کئی احرار راہنما کانگرس اور جمعیت العلماء کے ذہن کی سفارت کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی سے ایک گونہ عقیدت رکھتے اور ان کی ذات کے لئے نبرد آزما ہوتے تھے۔

۷۔ انہوں نے ہندوستان کی قومی تحریک میں للہی جذبے سے بے مثال قربانیاں کیں حتیٰ کہ اپنی عمروں کا بیشتر حصہ جیلوں میں گلا دیا۔ لیکن کانگرس اور لیگ دونوں نے صرف نفرت کا صلہ دیا۔ جب وہ برطانوی حکومت کے خلاف کانگرس کے ذہن کی تائید کرتے تو مسلمان بدکتے جب مسلمانوں کے حقوق کے لئے آواز اُٹھاتے تو کانگرسیوں کو ناگوار گزرتا اور جب مدح صحابہ ایسی تحریک میں رہنمایانہ حصہ لیتے تو ہم مسلک مسلمانوں میں مذہبی دیوانگی کے سزاوار ہوتے۔ الغرض انگریز، ہندو اور مسلمان تینوں اپنے دوائر میں ان کے خلاف تھے۔

۸۔ احرار کسی خاص فکری تحریک کے مظہر نہ تھے۔ مگر ایجی ٹیشن برپا کرنے اور پروپیگنڈا

رچانے کے فن میں بے مثال تھے۔

۹۔ ان کے نظریات میں رومانی تضاد تھا مثلاً سیاست میں اینٹی برٹش ذہن کے وارث، مذہب میں حکومت الٰہیہ کے مبلغ، ثقافت میں اسلامیات کے دلدادہ، معاشیات میں دولت کی برابر تقسیم کے داعی، غرض ان کی تقریروں کا لب لباب قرآن وحدیث اور تاریخ وسیرت کا مرکب ہوتا اور مذہب ہی کے نام پر مسلمانوں سے مخاطب ہوتے۔

۱۰۔ انہوں نے احتجاجی سیاسی ذہن پیدا کیا لیکن تنظیم نہیں۔ چودھری افضل حق مرحوم سے زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا وہ تنظیم کو خدائی خدمت گار تحریک کے ہم پایہ بنا لیتے لیکن ان کی موت کے بعد جماعت کا یہ پہلو کمزور ہو گیا۔ شاہ جی جوڑ توڑ کے آدمی نہیں تھے وہ ایک رواں دواں انسان تھے۔

۱۱۔ احرار نے ساری زندگی شہروں یا قصبوں کو اپنی جد وجہد کا مرکز بنائے رکھا۔ دیہات کا رُخ دیر بعد کیا لیکن تبلیغی حیثیت سے! مرزائیت کے خلاف، اصلاح الرسوم اور بدعات کی بیخ کنی کے لئے یا پھر سیرت کے جلسوں میں!

شاہ جی مدت تک لوگوں کو السلام علیکم کہنا سکھاتے رہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے مسائل پر مسلسل وعظ کہے مگر لوگوں کے معاشی یا مجلسی مسائل کو تنظیمی اعتبار سے چھوا تک نہیں البتہ پنجابی مسلمانوں کو تجارت کی راہ پر لانے میں شاہ جی اور احرار نے عظیم خدمات انجام دیں۔

۱۲۔ احرار میں قربانی، احتجاج، حوصلہ اور خطابت کا جوہر وافر تھا، لیکن فکر، نظر کسوٹی اور قیادت کا تناسب مقابلتہً کمتر تھا۔ انہوں نے زمانے کے مطابق چلنے سے ہمیشہ گریز کیا ان میں سپاہی ہی سپاہی تھے لیکن مدبر الشاذ کالمعدوم ـــــ وہ ہنگامہ کے ایک لمحہ کو مصلحت کی سو سالہ زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ میدان میں بلا کے لڑ دیتے تھے لیکن ہزارہ شیوہ سیاست دان نہیں تھے۔

۱۳ - ان کی سب سے بڑی کمزوری وسائل کا فقدان تھا جو کچھ تھے اپنے ہی اندر تھے، ان کی "سپلائی لائنیں" خارج میں نہ تھیں۔ وہ فقر و فاقہ اور جوش و غضب کا ہراول دستہ تھے۔

۱۴ - انہیں امراء کے ذہن سے حد درجہ تنفر تھا اس تنفر ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے تحریک پاکستان کو عوام کی بجائے خواص کے آئینہ میں دیکھا اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ:

" جن لیگیوں اور کانگرسیوں کو سیاسی اور اقتصادی مساوات سے گھن آتی ہے وہ سُن لیں کہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں، نہ وطنی۔ وہ لیڈروں کا ذہن رکھتے ہیں ان کا اور احرار کا ساتھ نبھ نہیں سکتا ـــــ ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تم تقسیم ہند کے قائل ہو؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قبل سائل سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ تم دولت کی منصفانہ تقسیم کے قائل ہو؟ اگر قائل ہو تو پھر ہندوستان ایک طرف رہا ہم شہروں کی تقسیم کے بھی قائل ہیں لیکن ہم اس کے سخت خلاف ہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دے کر کسی یزید جیسے مسلمان کے لئے تخت سلطنت بچھایا جائے۔" (تاریخ احرار صفحہ ل م) جان گنتھر کے نزدیک احرار مذہبی اعتبار سے فرقہ پسند فدائی اور سیاسی اعتبار سے انتہا پسند سیاستین تھے (دورِ حاضر کا اسلام) لیکن ماڈرن اسلام ان انڈیا ـــــــ کے مصنف مسٹر ولفریڈ سی سمتھ کا خیال تھا کہ احرار ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی پہلی مسلم سوشلسٹ تحریک ہیں۔"

ان محاسن و معائب کے پس منظر میں احرار کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے افسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تحریک کس بے دردی سے برباد ہوگئی ـــ تاہم ایک مورخ واقعات کی چھان پھٹک کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ احرار نے جس ذہن کی آبیاری کی اس کی بہت سی شاخیں ثمر آور ہوئیں، مثلاً

ا - مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں خلاف سامراج ذہن پیدا کیا جو پختہ ہو کر ان کی فطرت ہوگیا۔ اس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر درمیانے درجے کے مفلوک الحال

لوگ تھے۔

۲۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کا ذہن مسلمان امرار کے استحصالات سے برافروختہ ہو کر طبقاتی شعور کی راہ پہ آگیا۔ اس جماعت کا وجود بازار سیاست میں خرید و فروخت سے ہمیشہ ماورئ رہا۔

۳۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کی ایک کھیپ پیدا ہوگئی جس کا عام حالات میں قحط تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں اچھے مقرروں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا جس نے ذہنی انقلاب کی آبیاری میں قابلِ قدر حصہ لیا۔

۵۔ عام لوگوں کی چمڑی میں سے استحصالی گروہ کا خوف جاتا رہا، غربا میں احساس خودی توانا ہونے لگا۔

۶۔ مسلمانوں میں پہلے کی بہ نسبت کئی سو گنا بدعات کا خاتمہ ہوگیا اور وہ بعض معاشرتی گمراہیوں سے بچ نکلے۔

بعض تھڑدلے سیاست دان اس طبقاتی ذہن کو احرار کا پیدا کیا ہوا ذہن تسلیم کرنے سے شاید ہچکچائیں یوں بھی تاریخ شکست خوردہ لوگوں سے کبھی انصاف نہیں کرتی لیکن یہ ذہن (بغیر نام) بہرحال پاکستان کے مستقبل کا ذہن ہے۔ اور دنیا کے ضمیر میں یہ ہیجان برپا ہو چکا ہے کہ سرمایہ داری کا نظام ختم ہونا چاہیئے، دولت کی غلط تقسیم نے کروروں انسانوں کو ایک طرف مفلوج دوسری طرف مشتعل کر رکھا ہے۔